دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا علمی و دینی مجلہ

الحق

ماہنامہ

زیر سرپرستی

شیخ الحدیث حضرۃ مولانا عبدالحق بانی و مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور

مغربی پاکستان

لہٗ دعوۃ الحق

فون نمبر دارالعلوم ــ ۴ | قرآن وسنّت کی تعلیمات کا علمبردار | فون نمبر رسالئش ــ ۲

جلد : ۶ — ربیع الاوّل ۱۳۹۱ھ
شمارہ : ۸ — مئی - ۱۹۷۱ء

ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

مدیر ــــــ سمیع الحق

اس شمارے میں

نقشِ آغاز	سمیع الحق	۲
مولانا محمد علی جالندھری ؒ	مولانا غلام غوث ہزاروی مدظلہ	۷
زندگی کے ادوار اور کامیاب زندگی	حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمی مدظلہ	۱۱
اسلامی سوشلزم کی اصطلاح اور قرآنِ کریم	جناب سید اللہ بخش صاحب ایم اے	۱۸
خلافتِ عباسیہ کی معاشی حالت	ڈاکٹر محمد ریاض صاحب ایم اے	۲۵
عربی زبان	جناب مصنظر عباسی ایم اے	۲۹
حضرت تھانوی ؒ کی تعلیمات اور معاشرہ	پروفیسر احمد سعید صاحب ایم اے	۳۸
قبرص ــ صلیب وہلال کی رزمگاہ	جناب اختر راہی ایم اے	۴۴
ملفوظات شاہ فضل علی قریشی ؒ	جمع کردہ : خواجہ محمد نور بخش رح	۵۳
تبصرۂ کتب	ایڈیٹر	۵۷
ادبیات	مولانا محمد صدیق فاضل جامعہ ازہر وحقانیہ	۶۱

بدل اشتراک | مغربی اور مشرقی پاکستان سے ۸/- روپے ، فی پرچہ ۷۰ پیسے
غیر ممالک بحری ڈاک ایک پونڈ ، غیر ممالک ہوائی ڈاک دو پونڈ

سمیع الحق استاد دارالعلوم حقانیہ طابع وناشر نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا۔ (پرنٹر حاجی محمد حسین)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ آغاز

وطنِ عزیز پچھلے چند ماہ سے جس بحران میں مبتلا ہے، بظاہر اب اس کی شدّت میں اللہ کے فضل وکرم سے کمی آ رہی ہے۔ اور اسے ختم کرنے کے لئے اسلام دشمن سامراجیوں کا عالمی منصوبہ کافی حد تک ناکام دکھائی دے رہا ہے۔ مگر ایسے حالات جب کسی خوابیدہ اور غفلت شعار قوم کیلئے قدرت کی طرف سے جھنجھوڑنے کا ذریعہ ہوتے ہیں تو دیکھنا یہ ہے کہ ہماری قوم اس المناک سانحہ سے کیا سبق لیتی ہے جو ملک کے دونوں حصوں کی بہترین افرادی قوت کے ضیاع، معاشی تعطّل اور مادی نقصان کے علاوہ اعلیٰ انسانی اخلاق وکردار کی بربادی کا سبب بنا۔ کوئی مردہ قوم جسکی بدنصیبی پر تقدیر کا آخری فیصلہ صادر ہو چکا ہو، ایسے حالات سے صرفِ نظر کر سکتی ہے ورنہ ایک ایک ایسی قوم جو صدیوں کی غلامی کے بعد لیلائے آزادی سے بغلگیر ہو چکی ہو اور پھر اپنے مطلوب گم کردہ کی تلاش میں اپنی قومی زندگی کا بہترین عرصہ تیئس سال بھی گنوا چکی ہو اور وہ نہ صرف مسلمان کہلاتی ہو بلکہ پوری اسلامی دنیا کے دکھوں کا مداوا بننے کے دعوے لیکر کارزارِ آزادی میں اتر چکی ہو، اور وہ خیر امۃ کہلانے کی دعویدار ہو، اگر اتنی عظیم قومی قیامۃ سے بھی عبرت اور نصیحت نہ لے سکے تو شاید پھر میدان سعی وعمل میں قدرت کی طرف سے اسے سنبھلنے کا کوئی اور موقعہ ہی نہ مل سکے۔ ہمیں یعنی پوری قوم کو اپنے فکر ونگاہ اور قلب ونظر کی تمام وسعتوں اور گہرائیوں سے کام لیکر ازسرِنو ان تمام محرکات کا جائزہ لینا ہو گا جو ان حالات پر منتج ہوئے اور ان تمام اسباب کو کرید کرید کر معلوم کرنا ہو گا جنہوں نے یہ روزِ بد دکھایا، قومی خودکشی کے اس ہولناک گڑھے تک نہ تو ہم یکایک پہنچے ہیں اور نہ ہم اس کی ذمہ داری کسی ایک فرد یا گروہ یا چند ایک اسباب پر ڈالکر اپنے احساس اور ضمیر کو خطاکاریوں کے بوجھ سے سبکدوش کر سکتے ہیں، خرابی جتنی بڑی ہو گی اس کے اسباب بھی اس سے زیادہ گہرے اور ہمہ گیر ہوں گے اور جرم کا ارتکاب بھی اس سے بڑے پیمانہ پر سرزد ہوا ہو گا۔ ایسے عظیم قومی المیہ میں بھی ایک دوسرے کو نیچا دکھا کر اپنی مطلب برآری کرنا اور کسی ایک گروہ کا دوسروں کے ذمہ سب کچھ لگا کر اپنا اُلّو سیدھا رکھنا، طالع آزما ابن الوقت اور ہوسِ اقتدار میں حواس باختہ لوگوں کا کام ہے۔ ورنہ مخلص ذہنیت ہمیشہ اپنے آپ کو سزاوار اور خطاکار سمجھتے ہوئے خرابیوں کی اصل جڑ معلوم کرنے کی کوشش کرتی ہے، اس

لحاظ سے ساری قوم کا فریضہ ہے کہ وہ پورے اخلاص اور درد و سوز سے سر جوڑ کر پورے اسباب پر غور کرے کہ پچھلے تیئس سال میں ہم نے کیا کہا اور کیا کیا، کیا کھویا اور کیا پایا — ؟ ملک و ملت کی حقیقی فلاح کیلئے ہم کن راہوں پر گامزن ہوئے اور قوم و ملک کی تشکیل و تعمیر ہم نے کن خطوط اور بنیادوں پر اٹھائی ۔ قومی سالمیت میں کن لوگوں اور کن نعروں نے رخنہ ڈالا، کون سے خودغرض سیاستدان تھے جنہوں نے علاقائی، قومی وطنی اور لسانی جھگڑے اٹھا کر ہمارے عظیم جذبۂ وحدتِ اسلامیہ کو پاش پاش کیا یا وہ کونسی ذہنیت تھی جب کہ آزادئ وطن کی خاطر مسلمانوں کی جان و مال اور آبرو ظالم اور عیار انگریز کے ہاتھوں لٹ رہی تھی تو وہ انگریز کی حاشیہ برداری میں پیش پیش رہی ۔ مگر جب آزادی نصیب ہوئی تو یہی ظالم ذہنیت تھی جس نے آگے بڑھ کر ایک مسلمان اور آزاد قوم کے فکر و نظر اور قلب و ذہن کو انگریزیت کے غلامانہ بندھنوں میں محصور و مفلوج کر کے رکھ دیا ۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ کون سے عیار تھے جنہوں نے وطن اور قوم کی تعمیر کے نام پر پوری ملّت کا رخ ایمان، اسلام، اخلاق، اقدار اور روحانیت کی بجائے پیٹ، مادہ، معاش، سرمایہ داری اور بالآخر سوشلزم کیطرف پھیر دیا اور اس طرح نظریۂ پاکستان ۔ لا الٰہ الا اللّٰہ محمد الرسول اللّٰہ ۔ سے پوری قوم کا رشتہ کاٹنے کا ناقابلِ معافی گناہ کیا — اور وہ کون سے لوگ تھے جو ملک کے دونوں حصّوں کے درمیان پھیلی ہوئی وسعتوں کے باوجود اپنے مذموم مقاصد کیلئے یک جان دو قالب بن کر ایک دوسرے کے مادی اور غیر اسلامی نعروں اور معاشی نظریوں میں رنگ بھرنے میں پیش پیش ہوتے تھے ۔

— ایسے تمام اسباب، محرکات کو نگاہ میں رکھ کر ہمیں آگے کیلئے سوچنا اور لائحہ عمل تجویز کرنا ہوگا، اگر ہم وقتی سکون اور ٹھہراؤ سے یہ سمجھیں کہ مرض بالکلیہ زائل ہو چکا ہے اور آنے والے کسی طوفان کا خطرہ ہی ختم ہو گیا ہے تو یہ ہماری سب سے بڑی بھول ہو گی ۔ مرض اور خرابی کے استیصال کے لئے ایک ایک جڑ تک پہنچنا ہوگا، اور پوری قومی سطح پر وہ اقدامات کرنے ہوں گے جو آئندہ ہمیشہ کیلئے ایسے حالات کا سدّباب کر سکیں ۔

اس میں اوّلین بات یہ ہے کہ مشرق و مغرب کے مسلمانوں میں باہمی اعتماد و محبت، الفت اور یگانگت کے وہ جذبات نئے سرے سے ابھارنے ہوں گے جو کسی مسلمان قوم کو سیسہ پلائی دیوار اور جسدِ واحد بنائے رکھتی ہے ۔ یہ الفت و مؤاخات حقیقی معنوں میں اگر قائم ہو سکتی ہے تو کسی مادی، وطنی یا قومی بنیاد پر نہیں اور نہ کسی معاشی اور مادی تفاوت کی دوری پر بلکہ صرف اور صرف آسمانی نسخہ سے کہ اس نسخہ کو لیکر پورے معاشرہ کو بلکخت نئے سرے سے اسلامی خطوط پر

استوار کیا جائے۔

ہم اپنی ساری سیاست، تمدن، معیشت اور تہذیب و تعلیم اُس ذات کی مرضی پر چھوڑ دیں جس نے کامیابی اور پسندیدگی کی ضمانت صرف اور صرف اسلام کو دی ہے۔ ان الدین عند اللہ الاسلام۔ اور ۔۔۔ ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ۔

ہمارے ایسے انقلابی اقدامات جو اللہ اور رسول کی مرضی اور ہمارے قومی اور عالمی سطح پر کئے گئے اسلامی نظام کے بلند بانگ دعوؤں پر پورے اتریں اور ہم اپنے ملک و ملت کی پوری ہیئت حاکمہ اسلام کے سپرد کر دیں گے تو خود بخود ملک کے مختلف خطوں میں یکجہتی کے جذبات بیدار ہوں گے ۔۔۔ رنگ و نسل اور قومی و علاقائی بندھن ٹوٹ جائیں گے، اور مشرقی و مغربی پاکستان میں رہنے والے ہر مسلمان کے دل میں الفت و محبت کی موجیں پھوٹ کر دوسروں کو اپنی آغوشِ عافیت میں لینے کیلئے موجزن ہوں گی ۔۔۔ الفت و محبت پیدا کرنا اللہ اور صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے اور یہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کے بھیجے ہوئے لائحہ عمل کو اپنا لیا جائے۔ ورنہ جب رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ارشاد ہے کہ اللہ کی مدد نہ ہوتی تو پوری دنیا کو اس کی تمام وسعتوں کے ساتھ خرچ کر کے بھی آپ مختلف انسانوں کو ایک دوسرے سے نہیں جوڑ سکتے تھے تو چند معاشی یا لادینی فرسودہ مادی نعرے لگا کر ہم ہزاروں میل کی دُوریاں کیسے دُور کر سکتے ہیں ۔۔۔؟

یہ حجاب یہ نفرت یہ طبقاتی کشمکش اور یہ عداوت اور دشمنی اگر بدل سکتی ہے تو اُسی آسمانی نعرے سے جو روح کی گہرائیوں میں اُتر کر اقصائے مغرب میں رہنے والے مسلمان کو مشرقِ بعید کے مسلمان کا ہمدم اور ہمنشین دل بنا دیتا ہے۔ لو انفقت ما فی الارض جمیعا ما الفت بین قلوبھم ولکن اللہ الف بینھم ۔ آج ہم کہہ رہے ہیں کہ اللہ نے پاکستان بچایا، تو ہمیں اللہ کی طرف لوٹنا بھی چاہئے اور اس محسن کا شکر یہ بھی لازمی ہے جو ہماری نالائقیوں سے صرفِ نظر کئے جا رہا ہے۔ ورنہ ہمارے قول و عمل کی طرح یہ بھی ایک منافقانہ چال ہو گی

قوم حدی خوانوں کے جس رجز پر مخمور اور مدہوش ہو کر اس منزلِ ہلاکت و بربادی تک پہنچی ہے۔ اُس رجزیہ قصیدے کا بیت الغزل دو مصرعوں پر مشتمل تھا۔ ایک سوشلزم اور دوسرا جمہوریت۔ اور اب یہ ساری کرشمہ کاری بھی انہی دو لفظوں کی سحر طرازیوں کی ہے۔ ع

بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

سوشلزم کو تو جانے دیجئے جس کا خمیر ہی اللہ، رسول اور مذہب سے بغاوت کی خاطر اٹھایا گیا ہے، جمہوریت جمہوریت سے آسمان سر پر اٹھانے والے اور اسے "مسلمان قوم" کی ساری مصیبتوں کا علاج سمجھنے والے بھی ذرا سوچیں کہ اس جمہوریت نے ہمیں کہاں تک پہنچا دیا ہے؟ پاکستان کی مثال ہمارے سامنے ہے، سیلون ماتم کر رہا ہے، پنجاب اور سندھ میں عقل و خرد کا جنازہ نکل چکا ہے، جمہوریت کی دُھن میں آکر ہم نے جو کچھ تعمیر کیا دوسرے ہی لمحے [illegible] ہوئی بڑھیا کی طرح اپنے کاتے ہوئے کو بکھیر دیا۔ ہماری نگاہ غفلت شعار پہلے ہی لمحہ اس حقیقت [illegible] پر جاکر ٹھہر جاتی کہ مسلمان قوم کیلئے عصرِ حاضر کے سوشلزم اور جمہوریت دونوں ہی سمّ قاتل ہیں۔ اگر ایک کفر ہے تو دوسرا اس سے بڑھ کر کفر۔ تو آج ہم اس مقام تک نہ پہنچتے اسلام کہتا ہے کہ تشریع اور قانون سازی کا حق صرف اور صرف اللہ کو ہے۔ ہم قانون بنانے والے نہیں قانون دان ہیں ــــ اُس کا اعلان ہے کہ خلق اور امر کے سارے سررشتے اُس کے ہاتھ میں ہیں۔ الا لہ الخلق والامر ــــ ولایشرك فی حکمہ احداً ــــ یقولون لوکان لنا من الامر من شیئ قل ان الامر کلّہ للہ۔ اس کی نگاہ میں برائی برائی ہے خواہ اس کو اچھائی کہنے والوں سے ساری دنیا کیوں نہ بھر جائے۔ وہ انسانوں کو گنتا نہیں تولتا ہے ــــ کیا ہماری قوم اور وہ لیڈران کرام جن کا اوڑھنا "اسلام" اور بچھونا "جمہوریت" ہے۔ اس تلخ ترین انجام سے کچھ سبق سیکھ سکیں گے ــــ؟

مولانا محمد علی جالندھری اللہ کو پیارے ہو گئے، جہادِ حریّت کا نڈر سپاہی اور عقیدۂ ختمِ نبوّت کا جانباز شیدائی اور فدائی بھی ہم سے جُدا ہو گیا ــــ مجلس احرار اسلام کی سٹیج ہو یا مجلس تحفظ ختمِ نبوّت کی مسندِ امارت، جنگِ آزادی ہو یا تعمیرِ وطن کا کوئی دوسرا موقعہ، یہ سراپا اخلاص و درد مجاہد ہر میدان میں شعلۂ جوّالہ بن کر حق کی حفاظت کے لئے چمکتا رہا۔ آخری زندگی تو عقیدۂ ختمِ نبوت کی حفاظت اور دفاع ہی کے لئے وقف ہو کر رہ گئی تھی۔ اور یہاں تک کہ جان، جان آفرین کو سپرد کرتے وقت آخری الفاظ جو زبان مبارک سے سنے گئے، وہ "اے اللہ ــــ ختمِ نبوّت" تھے ــــ آہ جانے والے اکابر ہمارے لئے اخلاص، جوشِ عمل، دینی حمیت، مقصد سے شغف، ولولہ، اور سوز و للہیت کے کیسے کیسے نمونے چھوڑ کر چلے گئے ہیں ــــ حالیہ انتخابات میں جب ایک سیاسی پارٹی نے ہوسِ اقتدار میں چند قادیانیوں کو بھی اپنی پارٹی ٹکٹ پر نامزد کیا تو مولانا بے چین اور مضطرب ہو کر میدان میں کود

پڑے اور رمضان کا سارا مہینہ ایک ایک حلقہ میں جاکر مسلمانوں کو خطرہ سے آگاہ کرنے میں بسر کیا۔ پھر جب تسلی ہوئی کہ اللہ نے ایسے تمام نمائندوں کو خائب و خاسر بناکر ناکام کیا اور کوئی قادیانی مجلس قانون ساز میں نہیں پہنچ سکا تو یہ مژدہ پوری قوم کو سناکر اطمینان کا سانس لیا۔ ابھی مولانا کی شدید ضرورت تھی اور کسی کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا اتنے جلد اور ایسے نازک موقعہ پر وہ ہم سے جدا ہوں گے۔ مگر مرضئ مولیٰ کے سامنے کس کی چلتی ہے۔ مولانا ہم سے جدا ہوگئے مگر اپنے پیچھے علم وعمل، جہاد اور جہد کا ایک نورانی دفتر چھوڑ کر گئے۔

ختم نبوت کی صدا انہوں نے یورپ اور افریقہ کے ایوانوں تک پہنچادی۔ اب یہ کام پیچھے رہنے والے تمام معتقدین، احباب اور بالخصوص ان کی محبوب جماعت تحفظ ختمِ نبوت کا ہے کہ ان کا محبوب مشن دفاع واشاعت ختم نبوت کو اور بڑھا چڑھا کر مولائے ختم المرسلین علیہ السلام کی خوشنودی اور اپنے قائد مولانا محمد علی جالندھری کی روح کی ٹھنڈک کا سامان کریں۔

واللہ یوفقنا وایاھم ورحم اللہ الفقید فقید الاسلام والمسلمین۔

حکومت آزاد کشمیر کے نئے صدر سردار عبدالقیوم خان صاحب نے ریاست میں اسلامی اصلاحات نافذ کرنے کے سلسلہ میں بعض اہم اور بنیادی احکام جاری کئے ہیں اور اسطرح اس گئے گذرے دور میں صالح حکمرانوں کی یاد تازہ کی ہے۔ اقامۃ صلوٰۃ اور اسطرح کی دیگر ہدایات ایک مثالی اسلامی معاشرہ اور عادلانہ حکومت کا پیش خیمہ بن سکتی ہیں، بشرطیکہ نہ صرف ان اقدامات پر عملدرآمد کا بھرپور اور موثر احتساب کیا جائے بلکہ تدریجاً حکومت کے ہر شعبہ میں اسلام کی حاکمیت قائم کی جائے، بلاشبہ اگر صدق دل اور ایمانداری سے عالم اسلامیہ کا کوئی دور افتادہ مختصر سا علاقہ بھی اپنے دائرہ میں اسلامی نظامِ حیات قائم کرنے کا بیڑا اٹھائے تو وہ دینی ودنیوی سعادتوں کے لحاظ سے پوری دنیا کیلئے ایک نمونہ بن سکتا ہے۔ ہمارے اسلاف اس مقصد کیلئے قدم جمانے کی خاطر ایک بالشت زمین بھی کافی سمجھتے تھے لیکن اب جبکہ ایمان ویقین احساس خودی اور فکر ونظر کی آزادی عنقا ہوتی جارہی ہے، ہفت اقلیم بھی ہاتھ آجائے مگر ہماری خود فراموشیوں کی وجہ سے کسی اسلامی مملکت کی خواب شرمندۂ تعبیر ہونی مشکل معلوم ہورہی ہے ــــ ان حالات میں حکومت آزاد کشمیر کا یہ اقدام جتنا بھی ہے ہم اسے غنیمت سمجھ کر تمام مسلمانوں کیطرف سے تحسین وتبریک کا مستحق سمجھتے ہیں ــــ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

سمیع الحق

یادِ رفتگاں

مولانا محمد علی صاحب جالندھری مرحوم

مولانا ہزاروی مدظلہ نے یہ تاثرات اپنے رفیق طریق مولانا جالندھری مرحوم کے بارہ میں ایڈیٹر الحق کی فرمائش پہ دارالعلوم تشریف آوری کے موقع پر قلم برداشتہ تحریر فرمائے۔ (ادارہ)

قرآنی حقائق زمانے کے سینکڑوں دور گزرنے پر بھی الآن کما کان قائم و دائم رہتے ہیں۔ دنیوی زندگی کی بے ثباتی اور دارِ آخرت کے دوام و بقا پر آسمانی مذاہب متفق ہیں، اور اسی لئے رجالِ آخرت یعنی اللہ والے امورِ خیر اور اعلاء کلمۃ اللہ کی مساعی میں ممکن عجلت سے کام لیتے ہیں۔ جانے کا وقت اور اجل مسمّی کا علم اسی ذات واجب الوجود کو ہوتا ہے جو خالقِ کائنات اور ازلی علیم وخبیر ہے۔

ایک وقت تھا جب دنیا ابتداء سے انتہا کی طرف اور طفولیت سے شباب اور شباب سے کہولت اور پختگی کی طرف آ رہی تھی۔ تو حضرت نوح علیہ السلام سے کچھ عرصہ کے بعد ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ جو ملتِ ابراہیمی کی بنیاد تھے۔ پھر پے در پے انبیاء علیہم السلام کے آنے جانے کے بعد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے اس پیغمبر آخر الزمان کا ظہورِ قدسی ہوا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی دعاؤں کا نتیجہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشنگوئی کا مظہر تھے۔ اب روحانی مدارج کو کمال نصیب ہو گیا تھا ـــ البتہ جسطرح شریعتِ مطہرہ اصول و مبادی بلکہ ضروریات کی تکمیل کے باوجود بہت سی باتوں کی تفاصیل محدثین و مجتہدین امت کے ہاتھوں پوری کرنی مقدر تھیں۔ اسی طرح باطنی روحانی اقدار کی تفاصیل اور مکمل ظہور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عشاق و متبعین یعنی اولیاء اللہ کے ہاتھوں ہونا تھا۔ بہرحال اصولی طور پر شرعی ظواہر و بواطن اور روحانیت کا کمال ہو چکا تھا۔ مادی اعتبار سے دنیا کو ابھی بہت سی منزلیں طے کرنی تھیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے علم پاکر اور اپنی دور رس بصیرت سے تقاربِ اماکن کثرتِ غنا (گانے بجانے کی کثرت) ملاحم (عظیم لڑائیوں) اور مادی غلبہ کی خاص خاص باتیں بتا

دی تھیں۔ اور ساتھ ہی دینی کمزوریوں اور وھن یعنی کراہیت موت وحب دنیا کی اطلاعات بھی دیدی تھیں۔

اس تمہید سے بخوبی یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ تخلیق کائنات کے مقصد پورا ہوجانے کے بعد دنیا کی بساط الٹنے اور وسیع وعریض مخلوقات کو سمیٹنے کا کام شروع ہوجانا چاہئے۔ اس صورت میں سوائے اس کے کہ ہر آنے والا دن زوال پذیر حالات کی خبر لائے اور کیا ہونا چاہئے۔

چنانچہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نے نہ صرف نبوت کا دروازہ بند کردیا بلکہ آپ کے بعد جو جلیل القدر ہستی روپوش ہوئی ہے اسکی جگہ پر نہیں ہوسکا۔ آپ کے بعد آپ جیسا آنا تو ممکن ہی نہ تھا۔ صدیق کے بعد صدیق جیسا اور فاروق کے بعد فاروق جیسا پیدا نہ ہوا۔ خلفاء راشدین کے بعد خلافت راشدہ ناپید ہوگئی۔ کبار اولیاء اور حفاظ وآئمہ حدیث نیز مجتہدین کے بعد اہل عالم ان جیسے حضرات کی صحبت وفیضان سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئی۔ حتیٰ کہ شاہ ولی اللہ کے بعد ولی اللہ پیدا نہ ہوئے۔ نہ شیخ الہند کے بعد کوئی دوسرا محمود الحسن دیوبندی پیدا ہوا۔ نہ شیخ الاسلام حضرت حسین احمد مدنیؒ کو پھر کسی نے دیکھا نہ علامہ انور شاہ کی نظیر مل سکی۔ نہ حضرت عثمانیؒ آئے نہ حکیم الامت تھانویؒ۔ نہ مفتی کفایت اللہؒ اور نہ حضرت لاہوریؒ۔ غرضیکہ جو گیا ان جیسا پھر نہیں آیا۔ وہ مقام خالی ہی رہا۔ چند سالوں میں ہمارے اور اکابر علماء و اولیاء ہم سے جدا ہوئے مگر اب ان جیسوں کے لیے آنکھیں ترستی ہی رہتی ہیں۔ امیر شریعت بخاریؒ اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری کی وفات کو ابھی دنیا یاد ہی کررہی تھی۔ کہ ان کی آخری نشانی حضرت مولانا محمد علی صاحب جالندھری کی وفات حسرت آیات کی خبر وحشت اثر سے دلوں پہ بجلی جیسی گری۔

حضرت مولانا محمد علی صاحبؒ ان بزرگان دین میں سے تھے جنہوں نے باوجود صاحب جائداد ہونے کے کبھی فخر ومباہات اور ظاہری ٹھاٹھ باٹھ کو پسند نہیں کیا۔ نہ کسی وقت تواضع وانکسار اور دین دوستی کے جذبات کے تقاضوں کے خلاف کیا۔ دینی شعائر کی پابندی کے ساتھ سارا وقت تبلیغ دین میں خرچ کیا۔ انہام وتفہیم کا جو ملکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مرحمت فرمایا تھا۔ پچھلی صدی میں اسکی مثال مشکل سے ملے گی۔ حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم کی تقریر کے موقعہ پہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی کام پر مقرر فرمایا ہے۔ آپ نے مسئلہ ختم نبوت اور کلیدی اسامیوں پہ ملحدین ومرتدین کے تقرر کے خلاف جو مدلل تقریر فرمائی وہ انہی کا حصہ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جب دار الکفر ربوہ کے پاس قصبہ لالیاں میں ختم نبوّت کانفرنس ہوئی

اس میں حضرت مولانا مرحوم نے جو فاضلانہ تقریر کرتے ہوئے مسئلہ حیاتِ مسیح علیہ السلام پر دلائل پیش کر کے ان کے جواب کا مطالبہ امتِ مرزائیہ سے کیا۔ آج تک اس کا جواب امتِ مرزائیہ نہیں دے سکی۔

حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم نے اپنے پیش رو حضرت امیرِ شریعت بخاریؒ کے مشن کو پوری طرح نبھایا۔ آپ نے سارے پاکستان میں مجلس تحفظ ختمِ نبوّت کی شاخیں قائم فرمائیں۔ ختمِ نبوّت کا قیمتی اور بہترین دفتر تعمیر کر کے ملتان میں یادگار چھوڑ گئے۔ ختمِ نبوّت کا فنڈ بنایا۔ کتوں کے بھونکنے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انتہائی دیانتداری سے مسئلہ ختمِ نبوّت کی خدمت کی اور بلامعاوضہ (بلاتنخواہ) خدمت کرتے ہوئے مبلغین کی ایک بڑی تعداد تیار کر کے اپنے مالک سے جا ملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولاناؒ کی حقیقت شناسی اور وفاداری کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ کہ ۱۹۵۳ء میں تحریک ختمِ نبوّت کے وقت جب کہ ہزاروں مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا اور جیلوں میں گئے۔ اس سے قبل انہوں نے فیصلہ کیا کہ مبلغین مسئلہ نبوت کے لئے کام لیکہ کریں۔ یہ زیادہ اطمینان بخش اور حقیقی صورتِ خدمت ہو سکتی ہے۔ اس سکیم کو تقریباً سب نے منظور کیا۔ لیکن میں اپنے ایک عہد کی وجہ سے انکار کرتا رہا۔ آخر کار حضرت مولانا نے مجھے منوالیا۔ اور شاید ڈیڑھ سو روپے ماہوار گذارہ مقرر کر کے اس کام پر لگایا۔ مگر خدا کی شان کہ جلدی ہی تحریک ختمِ نبوت شروع ہو گئی۔ حضرت مولانا نے مجھے حکم دیا کہ تم گرفتاری دینا دفتر میں رہنا ضروری ہے۔۔۔ (دفتری کاروبار کرنا ہے) پھر ہمارے قیمتی نوجوان عالم ربانی حافظ حمید اللہ صاحب فرزند حضرت قطبِ ربانی مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ نے عین موقع پر دہلی دروازے سے باہر گرفتاری سے روک کر روپوش ہونے پر مجبور کر دیا۔ بہرحال جب تحریک گذر گئی اور اکابر علماء جیلوں سے باہر آگئے حضرت مولانا محمد علی صاحب نے ان بیسیوں مبلغین کو پورے سال کی تنخواہیں ادا فرماویں جو سال انہوں نے جیل میں گذارا تھا۔ اس سلسلہ میں مجھے بھی لکھا۔ مگر میں نے جواب دیا کہ میں اپنے کو اسکا مستحق نہیں سمجھتا جب کام نہیں کیا تو تنخواہ کیسی۔ پھر کام بھی اپنا فرض ہے۔ مولانا نے اٹھارہ سو روپے کی بجائے میری رضامندی سے شاید دو سو روپے میرے نام بھیجدئے۔ لیکن ہمیشہ میرے اس انکار کا ان کے قلبِ مبارک پر اثر تھا، اور کسی وقت بھی وہ مجھ پر بدگمانی کرتے دیکھتے تو جواب دیکر تردید کرتے۔۔۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بعض لیڈروں

نے اس تحریک میں تھوڑی بہت خدمت کی انہوں نے مولانا سے آٹھ دس ہزار روپیہ وصول کیا۔ بہرحال حضرت مولانا مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے ان گنت خوبیاں عطا فرمائی تھیں جنکو ساتھ لے جاکر وہ ہم سے جدا ہو گئے۔ اب جنت ہی میں انشاء اللہ تعالیٰ ملاقات ہو گی۔

مجلس احرار اسلام کانگرس سے بعض خصوصی مسائل کی وجہ سے علیحدہ ہو گئی اور باوجود جنگ آزادی کی حمایت کرنے کے تمام دینی تحفظات کے لئے سر بکف میدان میں کھڑی رہی۔ اسکی روح امیر شریعتؒ تھے۔ دماغ چوہدری افضل حق اور امیر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی تھے۔ اس اسلامی فوج کا میمنہ وغیرہ شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین انصاری تھے۔ ان حضرات نے اپنے گرد پنجاب، سرحد، سندھ اور یوپی کے مخلص کارکنوں کا جتھہ جمع کر رکھا تھا۔

یہ جماعت وقت پر اپنا فرض ادا کر گئی۔ اور ان کے وصال سے احرار کا بڑا قافلہ سفر ختم کر کے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ان حضرات نے دوسرا قافلہ تیار کیا تھا جس میں قاسمی احسان احمد صاحب شجاع آبادیؒ، مولانا محمد علی صاحب مرحوم پیش پیش تھے۔ احقر بھی بعض دوسرے دوستوں کی طرح اس کاروان کے خادموں میں سے تھا — اور الحمد للہ تعالیٰ کہ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، حضرت مدنیؒ، حضرت لاہوریؒ، حضرت امیر شریعتؒ کے مشن کو حتی الامکان پورا کرنے کی سعی کرتے رہے۔ حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم کی وفات نے جو خلا پیدا کیا ہے، وہ حسب بیان سابق پُر ہونا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کو جنت الفردوس نصیب کرے، ان کے جانشینوں کو استقامت بخشے اور ہمیں اسی راہ پر لے چلے۔ ربنا توفنی مسلماً و الحقنی بالصالحین۔ آمین۔

ارشادات حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمی مدظلہ
مہتمم دار العلوم دیوبند

ضبط و ترتیب
ابو حامد - ادارۂ الحق

انسانی زندگی کے مختلف ادوار

حیاتِ طیبہ

پہلا دور — حیوانی اور انسانی زندگی

یورپ نے چند روزہ عیش و عشرت کو مقصدِ حیات بنالیا ہے۔ پوری زندگی کا محور معدہ اور مادہ بنانا عصرِ حاضر کا چلتا ہوا فلسفہ ہے، نتیجۃً پوری انسانیت معدہ اور مادہ کے گرد گھومنے والی چکّی میں پس کر رہ گئی ہے۔ قرآن کریم کی نظروں میں جو زندگی پاکیزہ بامراد اور کامیاب ہے، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی مدظلہ نے اپنے مخصوص حکیمانہ اور متکلمانہ انداز میں ایک مبسوط خطاب میں اس پر روشنی ڈالی ہے یہ تقریر ادارۂ الحق من وعن ضبط کر کے اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔ اس کی ٹیپ مہیا کرنے پر ہم مولانا قاری سعید الرحمان صاحب راولپنڈی کے ممنون ہیں۔ (س)

★

(خطبہ مسنونہ کے بعد) من عمل صالحاً من ذکرٍ او انثیٰ وھو مؤمنٌ فلنحیینّہ حیاۃً طیبۃً ولنجزینّھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون۔

بزرگانِ محترم! قرآن شریف کی ایک آیت میں نے اس وقت تلاوت کی جس میں حق تعالیٰ شانہ نے انسان کی سعادت اور اسکی ترقی کا ایک بنیادی اصول ارشاد فرمایا ہے، جس کی کچھ تشریح اس وقت آپ کے سامنے عرض کروں گا۔ پہلے آیت کا ترجمہ سن لیجئے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں، جس نے بھی نیکی کی اور عمل صالح اختیار کیا، مرد ہو یا عورت، تو ہم اس کو ایک نہایت ہی پاکیزہ زندگی عطا فرمادیں گے جو حیات طیبہ ہو گی۔ صاف اور اعلیٰ ترین زندگی، اور اسکی اس نیکی پہ ہم بہت اجر و ثواب بھی اس کو عطا کریں گے — نیکی کرنے پر دو وعدے کئے گئے۔ ایک پاکیزہ زندگی کا، اور ایک اجر کا۔ اسے یوں سمجھئے کہ یہ مستعار

زندگی جو چند دن کی ہمیں دی گئی ہے حقیقت میں ہمارے پاس ایک امانت ہے اس امانت کو اگر نباہنا ہے تو ایمانداری کے ساتھ اس کو مالک کے سپرد کر دینا ہے۔ اس لئے کہ اس زندگی کے ہم خود مالک نہیں ہیں نہ ہم نے بنائی نہ پیدا کی نہ از خود اس کو ختم کر سکتے ہیں۔ دینے والے بھی حق تعالیٰ ہیں اور لینے والے بھی وہی۔ تو جس کے ہاتھ میں لینا اور دینا ہے وہی مالک قرار دیا جا سکتا ہے، ہمارے بلا ارادہ زندگی آ گئی، بلا ارادہ ہم سے چھین لی جائے گی ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے ۔۔۔ اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

تو محض ایک مستعار زندگی کو کسطرح ہم گذاریں ـــــ تو ہماری زندگی کا ایک مادہ ہے اور ایک ہے اسکی صورت کہ زندگی کے مادے کو بھی سمجھ لیا جائے اور اسکی صورت کو بھی آگے اسی زندگی کے بارے میں بہت سی صورتیں آئیں گی۔ مگر مادہ ایک ہی رہے گا۔ اسکی شکلیں بدلتی رہیں گی، مثلاً گارا ایک ہے اسی گارے سے برتن بھی اور دیگر سب سامان بھی بنا سکتے ہیں۔ یہ سب گارے کی شکلیں ہیں، مادہ مشترک رہے گا، اینٹ میں بھی گارا، بلڈنگ میں بھی اور برتنوں میں بھی ایک ہی مادہ پر مختلف شکلیں آتی ہیں۔ اس طرح زندگی جو ہمارے لئے ترقی یا تنزل کا باعث ہوتی ہے اخیر تک اس میں ایک ہی مادہ موجود رہتا ہے۔ اور یہ مادہ دو چار چیزیں ہیں۔ سب سے پہلی چیز کھانا پینا ہے۔ اسی سے مدارِ زندگی ہے اگر نہ کھائے نہ پیئے تو اسے مردہ کہا جائے گا۔ جیسا لا یأکلون الطعام۔ وہ بدن جو کھانا نہیں کھاتے۔ اس کے بعد پہننا اور اوڑھنا ہے۔ پھر رہنا سہنا یعنی مکان بنانا ہے جس میں ہم اپنی زندگی اور اپنے رشتے کو محفوظ کر سکیں اور اس کے بعد مؤانست اور انس باہمی سے زندگی بڑھانا ہے، جس کو تمدن تعاون توالد اور تناسل کہیں گے۔ یہی چار چیزیں کھانا پینا اوڑھنا، رہنا سہنا اور باہم مل جل کر رہنا یہ بنیادی چیزیں ہیں جن سے ہماری زندگی بنتی ہے اور یہی چار چیزیں آئندہ لوٹ پوٹ کر آتی ہیں۔ اور اس میں کچھ اسباب ہیں اور کچھ وسائل اصل میں چار ہی چیزیں ہیں۔

کھانے پینے کے لئے ضرورت ہے غلہ کی کاشتکاری وغیرہ کی۔ الغرض ایک لمبا دھندا ہے جس سے ہمیں چار دانے سپرد ہوتے ہیں، اس کیلئے بازار بنتا ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں مل جائیں، یہ خرچ کرتا اور کماتا ہے، تو کھانا پینا اصل تھا اسکی ضرورت سے بازار قائم کئے جائیں گے اور اسی کی خاطر پیشہ حاصل کیا جائے گا تو زمین، بازار، پیسہ، کھانے پینے، رہنے سہنے کے اسباب میں سے ہوئے۔ اسی طرح آپ امن و سکون قائم کریں، باہمی لین دین کریں تو اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ باہمی لین دین سے زندگی کے اسباب آسانی سے حاصل کئے جا سکیں اور کھانے

پینے، رہن سہن کی ضرورت سے یہ بھی ہے کہ آسمان بھی ہے جس سے پانی برسے، آفتاب بھی ہے جو گرمی پہنچائے، ہوا بھی ہے جو زندگی قائم رکھے تو یہ لمبا چوڑا کارخانہ اس لئے ہے کہ چار دانے چار کپڑے اور مکان ہمیں میسّر آجائے۔ تو پورا عالم خدمت کر رہا ہے۔ ہمارے لئے جب اتنی بات سمجھ میں آگئی۔

تو انسان کی زندگی کا پہلا دور یہ ہے کہ اس کا تمام تر مقصد کھانا پینا ہوتا ہے۔ جب بچّہ پیدا ہوتا ہے تو پیدا ہوتے ہی کھانے پینے کے لئے چلّاتا ہے۔ جہاں ماں نے اس کے منہ میں دودھ ڈالا وہ چپکا ہوگیا، معلوم ہوا کہ اس کا شور مچانا غذا کے لئے تھا۔ اگر وہ نہ چلّاتا تو ماں کو خبر نہ ہوتی۔ اگر بچّہ نہ روتا تو ماں کی چھاتیوں میں دودھ جوش نہیں مارتا۔ بچّہ کا رونا ایک فریاد ہے۔ ماں کی مامتا اور محبت جوش میں آتی ہے۔ اور جوش سے دودھ جوش میں آتا ہے اور دھاریں پھوٹتی ہیں تو سب سے پہلے پیدا ہوتے ہی نہ کپڑا مانگتا ہے، نہ مکان۔ پھر گرمی سردی ستاتی ہے تو چلّاتا ہے اور ماں کپڑا اوڑھتی ہے۔ معلوم ہوا کہ سردی گرمی ستا رہی تھی۔ زیادہ کپڑے لاد دیئے، پسینہ آگیا تو چلّانے لگا، تو ماں کے دل میں الہام ہوتا ہے کہ اب اسے گرمی ستا رہی ہے یہ کپڑے اتار دیتی ہے، اور پنکھا جھلنے لگتی ہے تو پہلی ضرورت تھی کھانے کی، دوسری لباس، تیسری گرمی اور سردی اور دھوپ سے بچنے کیلئے مکان کی اور ذرا بڑا ہوگیا، کچھ ہوش آیا تو اس میں اُنس و محبت کا مادہ بھی آگیا۔ اب چھوٹے بچوں کو تلاش کرتا ہے اپنے کیلئے، کسی بچے کو آپ نے نہیں دیکھا ہوگا کہ بڑے بوڑھوں کی صحبت میں بیٹھے گا، یا وہ علماء و صلحاء کی مجلس کو تلاش کرے گا کہ وہاں جاکر بیٹھ جائے، نہیں بلکہ اپنے ہم عمروں سے کھیل میں لگے گا۔ ؎

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

ہر چیز اپنی جنس کی طرف مائل ہوتی ہے۔ جوان جوانوں کی طرف، بوڑھا بوڑھوں کی طرف مائل ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں اُنس موجود ہے، وہ جانوروں کی طرح بھٹوں اور گھونسلوں میں نہیں رہ سکتا۔ ایک آبادی بنا کر رہتا ہے، شہری زندگی قائم کرتا ہے تاکہ اُنس و مؤانست آتی رہے اور انسان مشتق ہے اُنس سے ؎

وما سمّی الانسان الا لانسہٖ　　وما القلب الّا لانّہٗ یتقلّب

عربی کا شاعر کہتا ہے کہ انسان کا نام انسان اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ اس میں اُنس ہے اور قلب کے معنی لوٹ پوٹ کے ہیں، قلب ہر وقت متحرک رہتا ہے۔ خیالات اس میں اٹھتے

پلٹتے رہتے ہیں۔ اس تقلب کی وجہ سے اسے قلب کہنے لگے۔ اگر بچے کو آپ تنہائی میں ڈالیں تو چلائے گا اور اگر کوئی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اور کسی سے بولنے لگا تو چپکا ہو جائے، معلوم ہوا کہ اس میں انس کا جذبہ ہے وہ ابھر رہا تھا، اس کا علاج مل گیا، تو خاموش ہو گیا۔ یہ چار چیزیں ہی زندگی کا مادہ ہیں اور لوگوں کا یہ مقصود زندگی ہے۔ اس زندگی کا نام رکھیں گے ہم حیوانی زندگی یعنی حیوانیت کا تقاضا یہ ہے کہ کھائے پئے، آپ نے چوپایوں کو دیکھا ہوگا کہ جب بھی آپ دیکھیں گے گائے بھینس کو یا چر رہی ہیں، پھر بیٹھ رہی ہیں، پھر کھانے لگی ہیں۔ اس کے سوا کوئی کام نہیں ۲۴ گھنٹے جانور کا کام کھانے کا ہے، بھینس کو آپ پالیں گے تو ایک مستقل آدمی رکھنا پڑے گا کہ اس کی پرورش کرے، رات بھر کھڑے کھائے گی کچھ آنکھ لگ گئی پھر جب جاگی تو کھانے لگی۔ تو حیوان کا طبعی تقاضا کھانا پینا ہے گرمی میں سردی اور سردی میں گرمی حاصل کرنا یہ حیوانیت کا تقاضا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ انسان کی وہ زندگی جس میں کھانا پینا رہنا سہنا ہی مقصد ہو وہ حیوانیت کی زندگی ہے۔

اب جتنا بھی اعلیٰ سے اعلیٰ کھانا کھائیں گے، بہترین اور اعلیٰ بلڈنگ بنائیں گے یہ حیوانیت کا تقاضا ہے۔ سانپ اپنے لئے بھٹ بنا لیتا ہے، شیر اپنا ٹھکانہ اور چڑیا اپنا گھونسلہ بنا لیتی ہے۔ چیونٹیاں سوراخ تلاش کرتی ہیں۔ انسان بلڈنگ بنا لیتا ہے۔ کتنی اعلیٰ بلڈنگ کیوں نہ ہو حیوانیت کے دائرے سے آگے نہیں بڑھے گا۔ کتنا پاکیزہ لباس پہنیں گے، حیوانیت کے دائرے سے نہیں نکلے گا ——— تو بچہ ابتداء سے ان ہی چیزوں کو چاہتا تھا۔ یہ حیوانی زندگی تھی۔

اب ذرا شعور آیا دس برس کے بعد اس میں عقل کے مادے نے آنا شروع کر دیا۔ ابھی تک اس کی زندگی طبیعت کے نیچے تھی اور طبع بشری جو چاہتی تھی تو وہی کرتے تھے تو حاکم ہماری طبیعت اور ہم اس کے غلام اور محکوم تھے۔ اور فلاسفہ لکھتے ہیں کہ طبیعت بے شعور واقع ہوتی ہے، اس کے اندر جذبات ہوتے ہیں، شعور اور سمجھ نہیں ہوتی، تو ایک جاہل بادشاہ ——— طبیعت ——— حکم دیتی ہے کہ کھاؤ بھوک لگی ہم نے کھانا شروع کر دیا، چاہا پانی پینے کو ہم نے کہا بہت اچھا۔ چاہا مکان بناؤ ہم نے تعمیل شروع کر دی۔ تو ایک بے شعور حاکم کے احکام کے تحت زندگی بسر کر رہے تھے، کیونکہ یہ سب طبیعت کے تقاضے تھے۔ چودہ پندرہ برس بعد اب انسان کو شعور آنا شروع ہوا اور ہر چیز میں عقل سے غور کرنا شروع ہوا، اس میں سمجھ آتی۔ تو اس شعور و عقل کے بعد مادۂ زندگی بدلتا رہے گا۔ کل تک طبعی جذبہ سے کھا رہا تھا، آج عقل نے اس میں لطافت پیدا کی، ایک اجتماعیت کا مادہ ہے اور ایک ظرافت کا جو جمال پسندی کو .

کھاتے ہیں یعنی کھاتے مگر ذرا خوشنما بنا کر کھائے پہنے مگر ذرا عمدہ کر کے پہنے۔ رہے مگر ذرا بلڈنگ کو اچھا بنا کر رہے۔ اسکی طبیعت جب عقل کے نیچے آجائے تو عقل پورا زور لگائے گی مکان بنائے گی۔ ڈیزائن بھی اچھا۔ گویا فنِ انجنیری پیدا ہو گا کہ عمدہ عمدہ نمونے بنائے جائیں۔ کھانا طبعی تقاضا تھا مگر عقل نے چاہا کہ برتن بھی خوشنما ہوں۔ کھانے کا رنگ بھی ذرا عمدہ ہو نگاہوں کا سینکنا بھی مقصود ہو جاتا ہے۔ آج نوع بنوع کھانے بنتے ہیں۔ یہ سب عقل کا تقاضا ہے، طبیعت اس کے اندر کام کرتی ہے عقل اس کو ذرا درست کر لیتی ہے کہ اسکی شکل بھی عمدہ بنے۔ آپ کیک بنائیں گے، تو اس کا مادہ ایک ہی ہے مگر شکل الگ الگ بناتے ہیں۔ کسی کی چڑیا کی شکل بنا دی، کسی کی بھوا جیسی، اس میں رنگ بھر دئے، موتی لگا دئے کہ آنکھیں بھی دیکھ کے خوش ہو رہی ہیں۔ اگر یہ کچھ بھی نہ ہوتا تو مزہ پھر بھی پیٹ کا وہی رہتا۔ اگر آپ نے سردی سے بچنے کے لئے ایک موٹا سا کمبل اوڑھ لیا تو طبیعت کا تقاضا پورا ہو جائے گا۔ مگر عقل کہتی ہے کہ اس کا رنگ بھی عمدہ ہو اون بھی ذرا ملائم ہو ذرا قیمتی ہو کہ دیکھنے والا کہے کہ بڑا آدمی ہے۔ تو محض طبع بشری کا تقاضا تو ڈھانپنا تھا، مگر عقل کا تقاضا اسے خوشنما بنانا ہے ـــــ تو آج دنیا میں جو ڈیزائنوں کی افراط ہے کہ آپ کوٹھیاں نئی نئی طرز کی بنائیں، چھت بھی ایسی ہو، دیواریں ایسی ہوں، پلاسٹر اور دیگر آلات ایسے ہوں، یہ ہے ظرافت پسندی اور جمال پسندی جو انسان میں رکھی گئی، کپڑوں کے جو نمونے آج ہم دیکھتے ہیں، کوئی مادہ نہیں چھوڑا جس سے کپڑے نہیں بنائے۔ روئی کے کپڑے تو خیر ہیں ہی، اون درختوں کی چھال، گتوں اور کاغذ کے کپڑے بنتے ہیں۔ اور اب کانچ کے کپڑوں کے بنانے پر غور ہو رہا ہے۔ جتنی جڑی بوٹیاں جنگل میں ممکن ہیں انسان نے غور کر کے سب کے مطابق سارے طرز اور نقش و نگار بنائے۔ جالدار کپڑے الگ مشجر الگ دنیا نے اتنے رنگ کے کپڑے کبھی نہیں دیکھے جتنے آج دیکھ رہے ہیں۔

یہ محض طبیعت کا تقاضا ہے جس میں عقل اور جمال پسندی کی آمیزش ہو گئی۔ اگر نمونے کا حصہ چھوڑ دیا جائے تو گھونسلہ بنا کر جہاں چاہے رہ جائے، یہ سارے مسائل نمونہ کی خوشنمائی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ پینے کے لئے سوڈے کی دوکان پر جائیں گے تو رنگ برنگ کا پانی دیکھیں گے، کوئی سبز کوئی سرخ، کوئی زرد، کوئی نارنجی، ذائقہ درست کرنے کیلئے تو سب ایک ہی ہیں، مگر آدمی چاہتا ہے کہ جب میں پیوں تو آنکھوں کو بھی لذت ہو، ہاتھ کو بھی زبان کو الگ لذت آجائے اور سارے ذائقے جمع ہو جائیں۔ یہ چیز انسان میں ہے جانوروں میں نہیں رکھا گیا، جانور تو کھا پی کر ہضم کرے گا، بوجھ کر دے گا پیٹ میں، حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں گائے جسطرح کھاتی تھی آج دس ہزار۔

سال بعد اسی طرح کھاتی ہے، جسطرح پہلے تقاضائے حاجت کر رہی تھی، ایسے اب بھی کرتی ہے۔ یعنی اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، تو جانوروں میں یہ مادہ ظرافت اور جمال پسندی کا نہیں ہے، جنات میں بھی نہیں ہے، ویرانے میں رہتے ہیں کوئی بلڈنگ آج تک ان کی نہیں دیکھی۔ چڑیا، جانور کسی میں یہ مادہ نہیں، کسی درخت کو ٹھکانہ بنالیا کسی نے زمین کھود کر ڈیرہ بسالیا۔۔۔ مگر یہ انسان ہے جو جمال پسندی میں دنیا بھر کے مادے خرچ کرتا ہے۔ مکان کپڑا کھانے کی شکلیں بھی عمدہ عمدہ تجویز کرتا ہے۔

ایران سے بادشاہ ہندوستان کے پاس شہزادہ آیا مغلوں کی سلطنت کا زمانہ تھا۔ تو شاہی باورچی کو حکم دیا گیا کہ کوئی نئی قسم کی چیز تیار کرو، تو ناشتے کے لئے ایک چیز تیار کی اور بہت عمدہ ایک خوانچہ میں رکھ کر شہزادہ کے پاس لے آیا، شہزادہ تخت پر بیٹھا ہوا تھا، امراء دربار بھی حاضر تھے۔ بادشاہی باورچی ہدیہ لیکر آیا تو بہت عزت کے ساتھ اسے بلاکر حکم دیا کہ اسے دربار میں کھولدو، کھولا تو معلوم ہوا کہ بھینسے کا کٹا ہوا سر رکھا ہے اور تازہ خون بہہ رہا ہے، شہزادہ کو بڑا تکدر ہوا اور حیرت میں ہوا کہ یہ کیا بدتمیزی ہے، بادشاہوں کے پاس بھینسے کا سر لے آیا۔ اس نے کہا کہ صاحب معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ نے کبھی کوئی اچھی چیز کھائی نہیں ہے۔ اسے ذرا اپنے بادشاہ کو رعب دکھانا تھا۔۔۔ تو معلوم ہوا کہ ایک خاص قسم کی مٹھائی تیار کی گئی تھی، بھینسے کا سر تھا مگر اس کے اندر زبان ایک ذائقے کی مٹھائی تھی، دانت اور ذائقے کی مٹھائی، اسکی کھال میں اور ذائقہ تھا۔ جب اس بادشاہ نے چکھا تو حیران رہ گیا کہ عجیب چیز ہے۔ تو باورچی کو یہ حجت تمام کرنی تھی کہ تمہارے فرشتوں نے کبھی اس قسم کے کھانے نہیں دیکھے جو ہندوستان میں بنتے ہیں۔ یہ جمال پسندی تھی محض مٹھائی لاکے رکھ دیتے، شہزادہ کھا پی لیتا اس مصیبت کی کیا ضرورت تھی کہ اس کو بھینسے کی صورت دی اس کا گلا کٹا ہوا دکھایا کہ خون اس میں سے بہتا رہے، فن کا کمال دکھلانا تھا۔

ان فنی کمالات کے لئے آج دنیا میں مستقل کمپنیاں ہیں جن کا کام یہ ہے کہ میزوں کو سجائیں سینکڑوں روپے ان کو محض سجانے کے لئے اجرت دئے جاتے۔۔۔ تو طبع بشری تو کھانا پینا چاہتی ہے، عقل بشری چاہتی ہے کہ اس کے اندر خوشنمائی پیدا کی جائے۔ طبع بشری چاہتی ہے کہ کوئی بھولی مل جائے تو ان سے محبت والنس سے بات کی جائے، اور عقل چاہتی ہے کہ بات کریں تو لہجہ بھی شائستہ ہو، کلام بھی مہذب ہو، بیٹھنے اٹھنے کا ڈھنگ بھی ذرا اچھا ہو۔

انسانی زندگی | جب زندگی اس نوبت پر پہنچے اور کھانے پینے کو آپ عقل کے نیچے لے جائیں تو ہم اسے انسانی زندگی کہیں گے کل تک یہ چیزیں طبیعت کے حکم میں تھیں آج وہ عقل کی محکوم بن گئیں

پہلے ایک جاہل بادشاہ حکمرانی کر رہا تھا، اور اب ایک باشعور کی حکمرانی کے نیچے آگئیں یعنی عقل کی جس میں سوچ ہے سمجھ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک چیز اور بڑھ جاتی ہے، وہ یہ کہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے۔ خودغرض بچہ یہ چاہے گا کہ میں کھالوں، میرے بھائی بندے کھار ہے ہیں یا نہ اسے کیا؟ جانور ہے وہ خود پیٹ بھرنا چاہے گا اور بنی نوع جتنے ہیں ان کا پیٹ بھرا ہے یا نہیں اس کی بلا سے، ایک کتا آجائے گا، آپ ہڈی ڈالیں گے، وہ کھائے گا، دوسرے کتے کو ملے یا نہ اسے کیا۔؟ بلکہ دوسرا کتا آیا تو لڑنے مرنے کو تیار ہوا، بلکہ سارے محلہ کے کتوں سے لڑتا ہے، اسی طرح سے جانور لڑتے ہیں۔ آپس میں کہ میری غذا دوسرے کے پاس نہ جائے، یہ حیوانیت کا تقاضا ہے کہ طبع حیوانی بالطبع خودغرض واقع ہوتی ہے، اپنا نفع چاہتی ہے، دوسرے کا نفع نہیں، جب عقل آجاتی ہے تو وہ چاہتی ہے کہ عمدگی کے ساتھ میں بھی کھاؤں، مگر میرے بھائی بندے بھی کھائیں تو عقل نے آکر ایک اجتماعی زندگی سکھلا دی ــــ تو دو باتوں کا اضافہ کیا عقل نے ایک ظرافت یعنی جمال پسندی کا۔ اور ایک اجتماعیت کا کہ یہاں ہمیں مل رہا ہے، ہمارے بھائیوں کو بھی ملنا چاہیئے۔ یہ میری بات ہے کہ ہم تنہا بیٹھ کر کھائیں اور دوسرے بھوکے رہیں۔ تو جب آدمی میں یہ جذبہ پیدا ہو تو کہا جائے گا کہ یہ انسانی زندگی کے اندر آگیا۔ مگر اس کا مادہ بھی وہی چیز ہے جو حیوانی زندگی کا تھا۔ وہاں خودغرضی کی استعمال ہوتی تھی عقل کے نیچے آکر اجتماعی شان کے لئے استعمال ہونے لگی، اور سارے بنی نوع کا فائدہ ہونے لگا۔ اب اسی میں انسانی تمدن، لین دین تجارت اور زراعت قائم کرتا ہے تو اجتماعیت کی شان جمال پسندی اور بنی نوع کے فائدے کے لئے دیکھنا اور سوچنا یہ عقل کا کام ہے۔ تو مادہ وہی رہا مگر اس کی شکل عقل کی وجہ سے بدل گئی، تو حیوانی زندگی اور انسانی زندگی دونوں کا مادہ وہی ہے، مگر زندگی کی شکل بدل جاتی ہے، کیونکہ حکام بدلتے جاتے ہیں، اگر حاکم خودغرض ہے تو محکوم بھی خودغرض ہوگا۔ اور اگر حاکم کے اندر جماعت پسندی اور جمال پسندی ہو تو محکوموں میں بھی یہی چیز آئے گی۔ جب عقل نے دائرہ حکومت سنبھالا تو سارے افراد بنی آدم کا فائدہ اس میں ہوگا۔ یہ اس لئے کرتا ہے تاکہ میں بھی راضی رہوں اور میرے بھائی بند بھی راضی رہیں مثل مشہور ہے کہ نہ تنہا آدمی ہنستا ہوا اچھا لگتا ہے نہ تنہا روتا ہوا۔ کسی جماعت کے ساتھ مل کر ہنستا ہے تو ہنسی ہے۔　　(باقی آئندہ)

جناب سید اللہ بخش ایم۔ اے

اسلامی سوشلزم کی اصطلاح اور قرآنِ کریم

اسلام کے معاشی نظریہ کو بیان کرنے کے لئے کیا "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے۔؟ ذیل میں اس سوال پر بڑے مؤثر اور دلنشین انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ کہ قرآنِ کریم ایسی اصطلاحات کے بارہ میں کیا رہنمائی کرتا ہے۔؟ (سمیع الحق)

★

اصطلاحوں کے معاملے میں ہمیں محتاط رہنا چاہئے اور اسلامی حقائق و نظریات کی وضاحت کے لئے قرآنی اصلاحات ہی کرنی چاہئیں۔ اس کی وضاحت ذرا تفصیل طلب ہے:

غلط اصطلاحات ہمیں صداقت سے بہت دور لے جارہی ہیں

دنیائے علم میں اسماء و اصطلاحات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ جب ہم کسی جماعت کا کوئی نام رکھتے ہیں یا کسی علمی نظرئیے کے لئے کوئی اصطلاح وضع کرتے ہیں تو وہ نام اور اصطلاح اس جماعت اور اس نظرئیے کا سب سے پہلا تعارف ہوتا ہے اور سامع کے ذہن پر پہلا تاثر قائم کرتا ہے۔ اس لئے ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ اصطلاح ایسی وضع کی جائے جو مفہوم کو واضح کرے، مبہم نہ ہو، اس میں کسی قسم کا اشتباہ یا التباس نہ ہو کہ ذہن کسی دوسرے مفہوم کی طرف منتقل ہوجائے اور ذہنی مغالطے پیدا ہوں۔ اسکی وجہ ہمارے تعصبات ہوتے ہیں جن کو بیکن (BACON) بتوں (IDOLS) کا نام دیتا ہے، اُن کو بُت اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ غلط تصورات پر منتج ہوتے ہیں اور ہمیں صداقت سے بہت دور لے جاتے ہیں۔ ان بتوں میں سے ایک قسم (IDOLATORI) ہے جس کے معنی ہیں بازار کے بت۔ یہ وہ ذہنی مغالطے ہیں جن کا باعث ہماری تحریر اور گفتگو میں الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔ الفاظ

کی غلط اور مبہم تشکیل صحت ذہن میں شدید مخل ہوتی ہیں، اس سے مطلوبہ مفہوم بگڑ جاتا ہے، فکر میں الجھاؤ اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے اور انسان بے شمار مغالطوں اور بے سود بحثوں کا شکار بن کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے ہر شعبہ علم ایک نظام تسمیہ واصطلاحات (NOMENCLATURE AND TERMINOLOGY) رکھتا ہے جو مذکورہ بالا صفات پر مشتمل ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نہ صرف اپنا ایک نظام تسمیہ واصطلاحات رکھتا ہے، بلکہ وضع اسماء واصطلاحات کے لئے ہماری رہنمائی بھی کرتا ہے، کیونکہ اس کے نزدیک اسماء واصطلاحات کی صحت اور ان کا استعمال اجتماعی زندگی کی اصلاح کا اہم پہلو ہے۔

ہم آئے دن اپنے نظریوں کی وضاحت کے لئے اصطلاحات وضع کرتے ہیں اور ان پر قائم رہتے ہیں۔ ایسی اصطلاحات میں ایک اصطلاح "اسلامی سوشلزم" ہے جو آج کل پاکستان کے ایک مخصوص گروہ کے افراد کی زبان پر ہے اور اس کے استعمال کے جواز میں وہ مختلف دلائل پیش کرتے رہتے ہیں۔ بحیثیت ایک مسلمان کے اب دیکھنا یہ ہے کہ "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح قرآن کریم کی تعلیمات کی روشنی میں صحیح ہے یا غلط۔؟ اس سلسلے میں قرآن حکیم کی دو آیات پیش کی جاتی ہیں جن سے ہم راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ سورۃ البقرہ میں ہے:

یایھا الذین امنوا لاتقولوا راعنا وقولوا انظرنا واسمعوا ط وللکفرین عذاب الیم۔ (البقرہ ۲ : ۱۰۴)

"اے پیروان دعوت ایمانی! پیغمبر اسلام کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہو تو منکرین حق کی طرح یہ نہ کہو کہ "راعنا" جو مشتبہ اور مختلف معنیٰ رکھنے والا لفظ ہے، بلکہ کہو "انظرنا" جو غیر مشتبہ لفظ ہے۔ اور پھر جو کچھ تمہیں پیغمبر اسلام کہیں اُسے توجہ سے سنو، تاکہ بار بار پوچھنے کی ضرورت نہ پڑے۔ باقی رہے منکرین حق تو یاد رکھو انہیں پاداش عمل میں دردناک عذاب ملنے والا ہے"

یہود جب منافق کی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں شریک ہوتے تو حاضرین مجلس پر یہ اثر ڈالنے کے لئے کہ ہم طلب علم کا بڑا ذوق رکھتے ہیں آپ کو کہتے "راعنا"۔ "راعنا"۔ مراعات سے امر کا صیغہ ہے اگر مخاطب، متکلم کی بات اچھی طرح نہ سن سکے یا نہ سمجھ سکے تو متکلم کو اس بات کے اعادے کے لئے کہا جاتا ہے "راعنا"۔ یعنی ہمارے ساتھ رعایت برتئے، دوبارہ اس بات کو کہئے۔ جیسے انگریزی میں "I BEG YOUR PARDON" کہتے ہیں۔ عربی میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے "انظرنا" کا لفظ بھی ہے، جو نظر سے امر کا صیغہ ہے۔ جس کے معنی ہیں، انتظار کیجئے۔ ہمیں مہلت دیجئے، ہماری طرف توجہ فرمائیے، ذرا ہمیں سمجھ لینے دیجئے ——

یہود شرارتاً "راعنا" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ اس لفظ کے معنی صاحب رعونت، احمق، جاہل، اور اے ہمارے چرواہے کے بھی ہیں۔ نیز عبرانی زبان میں اس سے ملتا جلتا ایک لفظ ہے جس کے معنی ہیں۔ "سن! تو بہرا ہو جائے" اس کے برعکس "انظرنا" میں صرف ایک مفہوم پوشیدہ ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ "راعنا" کے لفظ میں ایک سے زیادہ مفاہیم اور احتمالات پوشیدہ ہیں۔ اس لئے اس سے روکا گیا۔ اس کی بجائے "انظرنا" کے لفظ کے استعمال کی تاکید فرمائی گئی تاکہ "راعنا" کے لفظ میں جو فساد کا پہلو مضمر ہے یا سوء استعمال سے پیدا ہو گیا ہے۔ اس سے متکلم اور سامع دونوں محفوظ رہیں۔ پھر یہ لفظ مخلصین اور منافقین کے درمیان ایک نشان امتیاز بھی بن گیا۔ اور صریح ممانعت کے بعد اس کے استعمال کی جسارت صرف وہ لوگ کر سکتے تھے جن کے اندر نفاق کا مرض اس قدر شدت اختیار کر چکا ہو کہ اس کو کسی صورت نہ دبا سکتے ہوں۔ مسلمان اس گستاخانہ مفہوم سے بے خبر اور خالی الذہن تھے ان کو ایسے الفاظ کے استعمال سے روکا گیا۔

پھر سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

من الذین ھادوا یحرفون الکلم عن مواضعہ ویقولون سمعنا وعصینا واسمع غیر مسمع وراعنا لیاً بالسنتھم وطعناً فی الدین۔ ولو انھم قالوا سمعنا واطعنا واسمع وانظرنا لکان خیراً لھم واقوم ولٰکن لعنھم اللہ بکفرھم فلا یؤمنون الا قلیلاً ۝ (النساء ۴ : ۴۶)

"اے پیغمبر! یہودیوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کا شیوہ ہے کہ الفاظ کو ان کے اصل موقع اور محل سے ہٹا دیتے ہیں۔ اس خیال سے کہ دین حق کے خلاف طعن و تشنیع اور نیش زنی کریں، اور کہتے ہیں" سمعنا وعصینا، اسمع غیر مسمع" اور "راعنا" اس طرح کلام میں الٹ پھیر کرتے ہیں۔ اس کے معانی میں تحریف کرتے ہیں۔ ۲۔ اگر یہ لوگ راستبازی سے محروم نہ ہوتے تو ان مشتبہ اور مختلف معنی رکھنے والے الفاظ کی بجائے "سمعنا واطعنا" "اسمع" اور "انظرنا" کہتے تو یہ ان کے حق میں کہیں بہتر اور درست تو تھا۔

ان آیات میں بھی "سمعنا وعصینا" کا ظاہری مطلب یہ تھا کہ ہم نے آپ کا ارشاد سن لیا اور آپ کے گمراہ کن مخالف اور معاند کا قول نہیں مانا۔ لیکن اصل مطلب یہ ہوتا کہ ہم نے تمہاری بات تو سن لی، لیکن اس کے ماننے سے انکار ہے۔ اسی طرح "اسمع غیر مسمع" کا ظاہری مطلب یہ تھا کہ کوئی مخالف یا رنج دہ بات آپ کے کان میں نہ جائے۔ لیکن یہود کا اصل مطلب یہ ہوتا کہ تمہیں

کوئی اچھی بات سنائی ہی نہ دے۔ "راعنا" کی تشریح پہلے ہو چکی ہے۔ بظاہر لہجہ میں تعظیم و توقیر نظر آتی تھی لیکن زبانیں تقیہ سے کام لیتی تھیں اور دل کے بغض و عناد کو چھپائے ہوئے تھیں۔ "طعنا فی الدین" کی تصریح نے بتا دیا کہ عرب یہود کی ساری حرکتیں بے خیالی سے نہ تھیں اور نہ تفریح طبع کے طور پر تھیں بلکہ اللہ کے دین پر طعن کرنا اور اسے مجروح کرنا مقصود تھا اس لئے "المعنا" و "اسمع" "انظرنا" کے الفاظ کی تعلیم ہوئی کہ یہ الفاظ التباس کے پہلو سے خالی ہیں، اب آپ غور فرمائیں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ کے استعمال سے منع فرمایا جن میں التباس کا پہلو موجود ہو۔ یہ الفاظ مختلف المعنیٰ ہیں، ایک صحیح مفہوم ہے اور ایک ذم کا مفہوم۔

سوشلزم کی معروف حقیقت | اب مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں آپ "اسلامی سوشلزم" کی ترکیب کو زیر بحث لائیں۔ "سوشلزم" سے اگر آپ کی مراد صرف "معاشی مساوات" ہے جو آپ لانا چاہتے ہیں تو یہ بھی ذہن نشین کر لیں کہ اس کا ایک دوسرا معروف مفہوم بھی موجود ہے، جس کے ساتھ کچھ ذہنی متقدمات (MENTAL ANTECEDENTS) کچھ ذہنی متلازمات (MENTAL CONCOMITANTS) وابستہ ہیں۔ یہ ایک ایسا نظام یا فلسفہ ہے، جس کی بنیاد خدا، رسالت اور آخرت کے انکار پر ہے۔ ایمان باللہ، ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت، قرآن حکیم کی تعلیمات کا خلاصہ ہیں، لیکن ان ہر سہ بنیادی حقائق کا انکار "معروف سوشلزم" کی بنیاد ہے بلکہ سوشلزم کے مومنین کو اس انکار پر فخر ہے اور اسی انکار کو وہ کامیابی کا ضامن خیال کرتے ہیں۔

"سوشلزم ماورائے مادہ کسی حقیقت کو نہیں مانتا۔ دنیا میں سب سے پہلا اور سب سے بڑا استبداد کا حامی خود خدا ہے۔" (BOLISHEVISM — by EDMOND CANDLER)

لینن کا خدا کے متعلق تصوّر یہ ہے:

"سرمایہ داری کی غیر مرئی قوتوں نے ذہن انسانی میں ایک ڈر کی صورت پیدا کر دی ہے جس سے ایک حاکم اعلیٰ کے تخیل کی بنیاد پڑی، اسے انسان نے خدا کے نام سے پکارنا شروع کیا لہٰذا جب تک خدا کا تصوّر ذہن انسانی سے فنا نہ کر دیا جائے یہ لعنت کسی طرح دور نہیں ہو سکتی۔"

(HAMMER AND SICKLE — by MARKS PATRICK)

"ان (اشتراکین) کے نزدیک زندگی صرف اسی دنیا کی ہے، اس کے بعد وہ کسی اخروی زندگی کے قائل نہیں۔ ان خیالات کی نشر و اشاعت کے لئے ان کی سوسائٹیاں قائم ہیں، جنہیں جمعیت منکرین (UNION OF THE GODLESS) کہا جاتا ہے۔"*

* RELIGION UNDER THE SOVIET — by PROFESSOR JULIUS F. HACKNER OF MOSCOW UNIVERSITY

لینن نے تیسری کل روس کانگرس منعقدہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جو خطبہ دیا تھا، اس خطبے کا ایک اقتباس یہ ہے:

"ہم ان اخلاقی ضابطوں کے منکر ہیں جن کی تبلیغ بورژوا طبقہ کی طرف سے کی جاتی ہے اور جو خدا کے احکام سے مستنبط ہوتے ہیں۔ یقیناً ہم کہتے ہیں کہ ہم خدا پہ ایمان نہیں رکھتے ہم ان تمام اخلاقی ضابطوں کے منکر ہیں جو مافوق البشر تصورات سے ماخوذ ہوں۔ پرانا سماج غریبوں اور مزدوروں کی نوچ کھسوٹ اور سرمایہ داروں و زمینداروں کی سرپرستی پر قائم ہے ہمیں اس سماج کو تباہ کرنا ہے۔ ہمیں ان زمینداروں اور سرمایہ داروں کا تختہ الٹنا ہے، لیکن اس کے لئے تنظیم کی ضرورت ہے۔ خدا ایسی تنظیم پیدا نہیں کر سکتا۔

(GOD COULD NOT CREATE SUCH ORGANISATION)

اس لئے ہم کہتے ہیں کہ وہ ضابطہ اخلاق جو انسانی سماج میں باہر سے لیا گیا ہو ہمارے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ یہ ایک ڈھونگ ہے۔"

آخر میں ایک ادیب کا اقتباس بھی سن لیجئے: ARTISYBASHEV اپنے مشہور ناول "SAMINE" میں لکھتا ہے:

"خواہشات انسانی کو بلا قیود و پابندی فرو کرنا ہی عین فطرت ہے۔ اس کے لئے نہ ضمیر کی آواز کی پرواہ کرنی چاہئے اور نہ ہی خدا اور انسانوں کے وضع کردہ اصولوں سے خائف ہونا چاہئے۔ بادہ نوشی یا کسی عورت سے جنسی تعلقات میں کوئی ایسی معیوب بات نہیں جس سے انسان خواہ مخواہ شرماتا پھرے۔ تند و تیز مے نوشی، ہیجان خیز جذبات اور عورت سے جنسی ربط فطری جذبات ہیں اور جو چیز فطری ہو وہ کیسے ناجائز ہو سکتی ہے۔"

یہ ہیں معروف "سوشلزم" کے افکار و خیالات! اب ایک ایسی ترکیب کیسے وضع کی جا سکتی ہے جو متناقض مفہومات پر مشتمل ہو، ایک طرف تو ایک ایسے معروف مفہوم پر قائم ہو جس سے خدا، رسالت، آخرت اور شریعت کا انکار لازمی ہو اور دوسری طرف اس اصطلاح سے "معاشی مساوات" کا مفہوم لیا جائے۔ ایسے اسماء اور اصطلاحات کو ہمیں ترک کر دینا چاہئے، خواہ ہمارا ذہن سوشلزم کے لادینی فلسفہ سے خالی ہی کیوں نہ ہو۔ اور ہم کتنی ہی نیک نیتی سے معاشی مساوات کے خواہاں ہونے کی وجہ سے اس لفظ کا استعمال کر رہے ہوں۔ نزول قرآن کے وقت مسلمان مخلصین کا ذہن بھی "راعنا" کے اس مفہوم سے۔ نا ہی تھا جو کہ شرارت پسند یہودیوں کے ذہن میں تھا۔

لیکن اس آیت کریمہ میں یا ایھا الذین امنوا کہہ کر مسلمانوں کو منع کیا گیا کہ "راعنا" کا لفظ استعمال نہ کریں بلکہ اس جگہ "انظرنا" کا لفظ استعمال کریں، کیونکہ "راعنا" کے لفظ ہی میں اشتباہ اور التباس موجود ہے۔ اس لئے ہمارے لئے لازم ہے کہ لفظ "سوشلزم" کو "اسلام" یا "اسلامی" کے لفظوں کیساتھ ترکیب دے کر نئی اصطلاح وضع نہ کریں۔ کیونکہ "سوشلزم" کے لفظ میں بھی "راعنا" "عصینا" اور "غیر مسمع" کے الفاظ کی طرح اشتباہ والتباس موجود ہے۔

ہمارا عالم دین جو سوشلزم کے ملحدانہ مفہوم سے خالی الذہن ہو کر اور اسے بے ضرر سمجھ کر صرف اس لئے یہ اصطلاح اپنا رہا ہو کہ وہ نیک نیتی سے صرف معاشی مساوات ہی کو لانا چاہتا ہے، اسے چاہیئے کہ بدوی مومن کی طرح "لا ازید ولا انقص" کہتے ہوئے اسلام کی قرآنی اصطلاح میں کسی قسم کا اضافہ نہ کرے۔ اگر اسے اسلام کے معاشی نظام کی تعبیر یا تفصیلات کے بارے میں دوسرے مکتبۂ فکر کے مسلمان علماء سے اختلاف ہے تو صاف طور پر یہ کہے کہ فلاں جماعت اسلام کے اقتصادی اور معاشی نظام کی جو تعبیر پیش کرتی ہے، اس سے مجھے اختلاف ہے۔ اس کے بعد اس اختلاف کو پیش کرتے ہوئے اسلام کے معاشی نظام کی وہ تعبیر جسے وہ حق سمجھتا ہے پیش کرے۔ لیکن اسلام کے معاشی نظام کی اپنی تعبیر کو جسے وہ پیش کر رہا ہو۔ "اسلامی سوشلزم" کا نام نہ دے۔ دوسرے "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح کا استعمال ہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ "اسلام" کی اصطلاح ناکافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کے ذریعہ جو ضابطۂ حیات انسان کو دیا اس کا نام "الاسلام" ہے۔ ان الدین عند اللہ الاسلام۔ صاف فرمایا، جو شخص بھی اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا ضابطۂ حیات تلاش کرے گا، وہ قابلِ قبول نہیں۔ ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ۔ جو کوئی اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کا خواہش مند ہو گا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے۔ (آل عمران : ۸۵)

اللہ تعالیٰ نے تکمیل دین واتمامِ نعمت کے وقت اعلان فرما دیا تھا: الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً۔ (المائدہ ۵ : ۳) مسلمانو! آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لئے دین "الاسلام" پسند کر لیا۔

اس لئے اسلام کے لفظ کا اصطلاح کی حیثیت سے استعمال لازمی ہے، اس کے ساتھ کسی اور لفظ کا اضافہ یا پیوند قطعاً نہیں ہونا چاہیئے اس سلسلے میں کسی دینی پیشوا یا سیاسی لیڈر کا کوئی قول یا تحریر ہمارے لئے حجت یا سند نہیں ہو سکتی کہ اس نے فلاں اصطلاح کا استعمال کیا

تھا، صرف اللہ اور اس کے رسول کی بات ہمارے لئے سند بھی ہو سکتی ہے، حجت بھی اور قولِ فیصل بھی۔

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

قرآن کی دی ہوئی اصطلاح "الاسلام" کے علاوہ دوسرے اسماء و اصطلاحات سامنے آئیں تو امت کے ایک ایک فرد کا جواب یہ ہونا چاہیئے: ان ھی الا اسماء سمیتموھا انتم وآباؤکم ما انزل اللہ بھا من سلطان (النجم ۵۳ : ۲۳) یہ صرف ایسے نام (اسماء) ہیں جو تم نے اور تمہارے بڑوں نے اختراع کر لیئے ہیں۔ خدا نے تو ان کی کوئی سند نازل ہی نہیں کی۔

اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ضابطۂ حیات و کائنات اسلام ہے اور اس پر چلنے والے مسلم ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ھو سمکم المسلمین (الحج ۲۲ : ۷۸) اسی نے تمہارا نام "مسلمان" رکھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں کونسا خلا ہے جس کو پر کرنے کے لئے باہر سے اور نظام درآمد کیا جائے اس خلا کی نشان دہی کی جائے تاکہ تمام دنیا جان لے۔

جناب ڈاکٹر محمد ریاض (ایم۔اے تہران)
اسلام آباد

قلمروِ خلافتِ عبّاسیہ کی معاشی حالت

ایک مطالعہ

خلافتِ عبّاسیہ کا آغاز ۱۳۲ ہجری میں ہوا۔ ابتدائی دور میں امن وامان کی صورت کو بہتر بنانے پر توجہ مبذول رہی اور اس کے بعد زراعت، تجارت اور تعلیم کے امور کو زیرِ بحث لایا گیا۔ زرعی پیداوار کی ترقی سے مبادلاتی تجارت تیز ہوئی اور ملک خوشحال ہونے لگا۔ پھر تعلیمی و تفکّری کاموں کو خاطر خواہ اہمیت دی جانے لگی۔ شروع شروع میں اندلس کے بعض وہ حصّے جو بنوامیّہ کے زمانے میں خلافتِ اسلامیہ کی قلمرو کا جزو تھے، خلافتِ عباسیہ سے منتزع ہو گئے تھے، مگر بعد کی بعض اضطراری جنگوں کے نتیجے میں مسلمانوں کو جو فتوحات نصیب ہوئیں، اس سے خلافتِ عباسیہ کی قلمرو کو کہیں زیادہ وسعت مل گئی۔

زراعتی پیداوار کی غیر معمولی اہمیّت کا آج بھی انکار نہیں کیا جا سکتا اور خلافتِ عباسیہ کے دور میں تو یہی پیداوار معاشی حالت کو بہتر بنانے کا بڑا ذریعہ تھی۔ پیداوار کی ترقی کی خاطر سرزمینِ عراق میں مصنوعی آبپاشی کے طریقوں کو بہتر بنانے پر بڑی توجہ دی گئی تھی۔ عراق کے جنوبی حصّے میں گندم اور چاول نیز کھجور کے درختوں سے بڑا حاصل ملتا تھا۔ ایران میں کپاس اور نیشکر کی پیداوار پر خصوصی توجہ دی جاتی رہی۔ بین النہرین کے علاقے میں دریاؤں سے نہریں نکال کر اور بعض صورتوں میں پانی کا ذخیرہ کر کے چاول کی کاشت کی جاتی تھی۔ مصر میں دریائے نیل کا ساحلی علاقہ پہلے سے ہی زرخیزی اور پیداواری صلاحیت کی خاطر مشہور تھا۔ یہاں سے ریشم کے حاصل میں اضافہ کیا گیا۔ شام کے زرخیز علاقے کو بھی آبپاشی کے ذریعہ بہتر پیداوار کا حامل بنایا گیا تھا۔

عرب ممالک میں آبپاشی کا نظام ابتدائی صورت میں اسلام سے قبل بھی موجود تھا۔ ہمارا اشارہ پانی کی ذخیرہ اندوزی، نہر سازی اور زیرِ زمین نالیوں کے بنانے کی طرف ہے، مگر جنگوں اور حادثات

نے اسے ایک مستقل صورت میں باقی نہ رہنے دیا۔ فاتحین کی انتقام جوئی کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ وہ ذرائع آبپاشی کو نابود کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ خلافت عباسیہ کے ابتدائی دور میں تاخت و تاراج کا جو بازار گرم رہا، اسکی زد نظامِ آبپاشی کے ذرائع پر بھی پڑی تھی۔ خلافت کے ارباب حل وعقد نے اس نظام کی درستی و بہتری پر کمر ہمت باندھی اور چند ہی سالوں میں حیران کن نتائج حاصل کئے۔ پیداوار کے اضافہ سے خراج کی آمدنی بھی بڑھی، یہ آمدنی حاصل کرنے میں عمالِ حکومت جو تغافل و تساہل برتتے تھے، خلافت عباسیہ کے زمانے میں اسے دور کرنے کے خاص انتظامات کئے گئے اور اس کا نتیجہ حوصلہ افزا رہا۔ دستی رہٹ بھی بنائے گئے اور نرم و حاصل خیز زمین میں ان کے ذریعے آبپاشی کی جانے لگی۔ ایک نمایاں اصلاح، آلاتِ زراعت کے بارے میں تھی۔ اس سے قبل ہل، کدال، بیلچے اور درانتی وغیرہ ساخت کے اعتبار سے وہی تھے جو سومریوں اور قدیم مصریوں نے استعمال کئے ہیں۔ خلافت عباسیہ کے دور میں یہ اوزار بہتر انداز میں بنائے جانے لگے۔ اس ضمن میں زمینوں پر تجربات کرتے اور دونوں قسم کے آلات کی افادیت کو پرکھتے تھے۔ مزید اصلاح یہ کی گئی کہ مملوکوں کی بجائے مالکوں کو زراعت کے کاموں میں لگایا گیا۔ بنوامیہ کے زمانے میں بنجر زمینوں کو کاشت کرنے، دلدلی علاقوں کو خشک کرنے، نمک زار زمین کو صاف کرنے اور نمک یا دوسری معدنیات نکالنے پر زرخرید غلام مامور تھے۔ آبپاسی کے نظام اور کاشتکاری کے جملہ امور کو غلاموں کے ہاتھ دے دیا گیا تھا ـــ یہ لوگ بے گار کے طور پر کام کرتے تھے مگر ظاہر کہ خوب سے خوب تر صورت تلاش کرنے کی انہیں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔؟ خلافت عباسیہ کے عہد میں غلاموں کو ایسے کام سپرد کر دینے سے ایک ہمہ گیر پیدا ہوا۔ اب غلاموں کو مدد کی خاطر ساتھ رکھا جاتا مگر زمین کے مالک سارا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھنے لگے تھے۔ زمینوں کے مالک دل لگا کر کام کرتے اور اس طرح ان کی پیداوار اور حکومت کے خراج میں اضافہ ہونے لگا۔

دربارِ خلافت میں شکایات موصول ہوئی تھیں کہ سرکاری مالیہ وخراج وصول کرنے والے عاملین بعض زیادتیاں کرتے ہیں۔ سالِ تو قمری مہینوں کے ساتھ مانا جاتا تھا مگر خراج وصول کرنے میں شمسی اور کبھی نجومی سال کا نام لے کر لوگوں کو پریشان کرتے تھے۔ خلیفہ المنصور نے ان شکایات کے ازالے کی خاطر سخت احکام جاری کئے تھے اس کے بعد جنسی یا نقدی مالیہ اور عشر عام طور پہ صحیح نہج پر لیا جانے لگا تھا۔ خلیفہ المنصور عباسی نے خاندانِ خلیفہ کے افراد اور بعض عالی مرتبہ افراد اور مذہبی شخصیتوں کو خراج کے معاملہ میں خصوصی مراعات دے رکھی تھیں۔ بعد

کے خلفاء نے ان مراعات کو منسوخ قرار دے دیا، اور خراج کو علی الستادی نافذ کر دیا۔

خلیفہ ہارون الرشید نے زراعت کی ترقی کی خاطر بڑی مساعی کی۔ اس نے جنسی کی بجائے نقدی صورت میں مالیہ وصول کرنے کا حکم دیا۔ اس طرح "مقررہ لگان" کی رسم پڑ گئی۔ خواہ کسی سال پیداوار کم ہو جائے، یا ٹڈی دل اور دوسرے حوادث سے کاشتکار تباہ حال ہو جائیں، مگر ایسی صورت میں عام طور پر خراج میں چھوٹ یا رعائت دے دی جاتی تھی۔ نقدی خراج وصول ہونے سے بیت المال طلا و نقرہ سے بھر گیا، اور یہ دولت تجارت کی خاطر استعمال ہوتی اور ضرورت کی اشیاء دوسرے ممالک سے منگوائی جائیں۔ اسی زمانے میں کاشتکاروں سے آبیانہ بھی لیا جانے لگا تھا۔ ہارون الرشید نے آبپاشی کی خاطر سرکاری طور پر سہولتیں فراہم کرنے کا اہتمام کیا تھا۔ اور اس خاطر آبیانہ لیتے تھے، جو کاشتکار سرکاری نہر سے پانی اپنے کھیت تک پہنچانے کا خود انتظام کرتے، وہ آبیانے کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دئے جاتے تھے۔

خلافتِ عباسیہ کا دور فقہ اسلامی کا زرّیں دور ہے۔ آئمہ اربعہ، امام اکابر رفقاء و تلامذہ نے اس دور میں شافعیؒ اور امام احمد حنبلؒ کے علاوہ ان کے سلسلے میں امام ابو محمد اور امام ابو یوسف کی خدمت خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، جو مالی امور میں خلفائے عباسی کو بڑے صائب مشورے دیتے رہے۔ امام ابو یوسف نے ایک طرف خراج اور جزیہ کو وصول کرنے کے دقیق طریقے بتائے، دوسری طرف مفلوک الحال مسلمانوں اور ذمیوں کے ساتھ انسانی ہمدردی کرنے کے اصولوں پر زور دیا۔ آپ کئی خلفاء کے مشیر اور ان کے دور میں قاضی القضاۃ رہے۔ اس دوران میں آپ نے بیت المال کا خیال رکھا اور ساتھ ساتھ عوام کا۔ باج و خراج عشر اور جزیہ کے بارے میں آپ بڑی دقت سے مشورے دیتے رہے ہیں۔

صنعت اس زمانے میں ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی اس کے باوجود خلافتِ عباسیہ کی قلمرو کے لوگ دوسروں سے پیچھے نہ تھے بلکہ بعض صنائع میں کسی قدر آگے ہی تھے۔ پارچہ بافی اور چرم سازی کے کام شہروں کے علاوہ دیہاتوں میں بھی ہوتے تھے۔ کپڑے انواع و اقسام کے بنتے۔ شام اور مصر کے کئی علاقوں میں سوتی اور ریشمی کپڑے اس نفاست سے بنتے کہ دوسرے ملکوں میں ان کی مانگ بڑھ رہی تھی۔ چرم سازی میں　　کی صنعت ممالک عرب میں قدیم ادوار سے رہی ہے۔ خلافتِ عباسیہ کے زمانے میں اسے ترقی ملی۔ اسلحہ میں تلوار، نیزے، ڈھالیں، برچھیاں، زرہ بکتر نیز لوازم سواری مثلاً زین اور لگام وغیرہ عمدہ اور بڑے پیمانے پر بنائے جاتے تھے۔

خلفائے عباسی نے تعمیر کی طرف خاص توجہ رکھی۔ اس دور میں خاصی عمارات تعمیر ہوئی ہیں۔ مسلمان معماروں کی خاطر بعض ہمسایہ ودوست ممالک کا تقاضا تھا کہ انہیں ان کے ہاں بھیجا جائے۔ خلافتِ عباسیہ کے زمانے میں اگرچہ مسلمانوں کی ہمسایوں کے ساتھ کئی جنگیں بھی ہوئیں۔ وسطی دور تو صلیبی جنگوں میں گذرا، اس کے باوجود دوسرے ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات باحسن وجوہ قائم تھے۔ متعدد چیزیں ایسی تھیں جنہیں دوسرے ممالک کو بھیجا جاتا تھا۔ مثلاً خام مال، کھالیں، روئی، پارچہ جات، جلی شیشے، مصر اور شام کا ریشم، ایران کی نیشکر اور قالین، وسطی ایشیا کا تانبا، ایران اور بین النہرین (عراق) کا مٹی کا تیل۔ ان کے مبادلے کے طور پہ سونا چاندی ہاتھی دانت، چینی کے برتن اور غلام کنیزیں منگواتے تھے۔ روم مشرقی، چین، برّصغیر ہند اور بعض یورپی ممالک کے ساتھ خلفائے عباسی نے مستقل تجارتی روابط قائم رکھتے تھے۔ بصرہ، عمان، صحار (موجودہ مسقط کے مقام پر) عباس اور شیلاب (خلیج فارس) بندرگاہیں اور تجارتی مرکز تھے۔ سمرقند، بخارا، ہمدان الی بغداد سے چینی سامان آنے کا راستہ تھا۔ روم مشرقی اور ہند کے ساتھ دریائی تجارت تھی۔ مغرب میں فرانس اور روس کے امرا اور شاہی خاندان کے لوگ عود کی لکڑی، کافور، موم اور شمع وغیرہ کے مستقل خریداروں میں شامل تھے، وہاں سے مسلمان تاجر قاقسم، سنجاب اور شیر وغیرہ کی کھالیں خرید لائے، اور ان سے پوستینیں بناتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ خلافتِ عباسیہ کے زمانے میں علم وادب کی بڑی ترقی ہوئی۔ نئے مکاتبِ فکر وجود میں آئے مگر وہ لوگ معاشی معاملات سے بے نیاز نہ تھے۔ معاشی استحکام نے ہی انہیں علمی وفکری ترقی کرنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ اس معاملے میں تفصیل کے جویا مندرجہ ذیل مآخذ ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ کتاب الخراج مؤلفہ ابو یوسف یعقوب الانصاری (۷۳۱ - ۷۹۸ء)

۲۔ کتاب الخراج از یحییٰ بن آدم مطبوعہ ہالینڈ ۱۸۹۴ء۔

۳۔ ضحی الاسلام از شیخ احمد امین مرحوم۔

۴۔ تاریخ الاسلام العالم از علی ابراہیم حسن۔

۵۔ احمد فرید الرفاعی عصر المامون (۳ جلد) قاہرہ ۱۹۲۸ء ■■

جناب مصطفیٰ عباسی ایم اے کلہوڑہ گلی - مری

وقت کا تقاضا —— عالمی زبان

اور

عربی

اس میں شک نہیں کہ دیگر مخلوقات پر بنی نوع انسان کی شاندار علمی اور معاشرتی تفوق اور برتری میں زبان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ مگر آج عالم انسانیت جن خطرات سے دوچار ہے اس میں بھی بڑا دخل لسانی مسائل کا ہے۔ دنیا بھر کی اقوام و ملل کے درمیان اتحاد و اتفاق کے لئے ایک مشترکہ ثانوی عالمی زبان کا ہونا ضروری ہے اور فاضل مقالہ نگار نے نہایت محنت اور عرقریزی سے ثابت کیا ہے۔ کہ اس معیار پر اگر کوئی زبان پوری اترتی ہے تو وہ ہے صرف عربی زبان —— توقع ہے کہ یہ مضمون ہر حلقہ میں غور اور دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ (م - ے)

★

اس وقت دنیا میں کم و بیش ساڑھے تین ہزار زبانیں اور بولیاں رائج ہیں۔ زبانوں کی کثرت اور بولیوں کے اختلاف نے اقوام و ملل کے معمولی اور سطحی نوعیت کے اختلافات کو شدید اور خطرناک بنا دیا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے مشہور عالم اور لسانیات کے فاضل علامہ سید سلیمان ندوی نے ۱۹۱۵ء میں فرمایا تھا:

"اگر ہندوستان ایک ملک بننا چاہتا ہے اور اس کے قومی تعلیمی اور سیاسی خیالات کو حیثیت ایک قوم اور ایک ملک کے ترقی کرنا ہے تو ایک مشترک زبان کے بغیر چارہ نہیں" (نقوش سلیمانی ص ۶)

اور دس سال بعد ۱۹۲۵ء میں ارشاد کیا تھا:

"اس وقت کوئی ایسا عقلمند ہندوستان میں نہیں جو اس ملک کیلئے ایک عام اور مشترک زبان کی ضرورت سے انکار کرے۔ اگر ہندوستان کو ایک قوم بننا ہے

تو مقامی زبانوں کے سوا ایک نہ ایک عام زبان بنانی پڑے گی ۔ (نقوش سلیمانی ص۲۲۶)
علامہ ندوی صاحب مرحوم کی ان عبارتوں سے اس امر کی تصدیق و تائید ہوتی ہے کہ انسانوں میں اتحاد اور تعاون کیلئے ایک عام اور مشترک زبان کا ہونا ضروری ہے ۔

نیز جسطرح بلا وصند کی مختلف اقوام و ملل کے اتحاد کے لئے ایک بین الصوبائی قسم کی زبان کا ہونا ضروری تھا ۔ اسی طرح آج دنیا بھر کی اقوام و ملل کے درمیان اتفاق و اتحاد کے لئے ایک عالمی یا بین الاقوامی زبان کا ہونا بھی ضروری اور لابدی ہے ۔

انسان کی مادی اور معاشرتی ترقی کا راز زبان کی وسعت اور ترقی میں ہے ۔ اگر انسان دوسرے جانداروں کی طرح اپنی زبان کو چند آوازوں تک محدود رکھتا تو مختلف افراد قومیں اور نسلیں ایک دوسرے کے تجربات سے استفادہ نہ کرسکتیں ۔ اس لئے کہ انسان کی تمام تر ترقی باہمی تعاون ایک دوسرے سے ہمدردی اور افہام و تفہیم کی بدولت ہوئی ہے ۔ اور یہ امور ایک ترقی یافتہ زبان کے بغیر متصوّر نہیں ہو سکتے ۔

حاصل کلام یہ کہ :

۱۔ انسان نے دوسرے جانداروں کے مقابلے میں جو شاندار معاشرتی ترقی کی ہے وہ زبان ہی کی بدولت ممکن ہوئی ہے ۔

۲۔ آج زبان کی شاخ در شاخ تقسیم اور بولیوں کے اختلاف نے دنیا بھر کے انسانوں میں اختلافات پیدا کر دئیے ہیں ۔ ایسے اختلافات جنہوں نے نہ صرف ترقی بلکہ عالم انسانیت کو خطرات سے دوچار کر دیا ہے ۔

عالمی زبان | عالمی زبان سے مراد ایک ایسی زبان ہے جو ساری دنیا میں رائج ہو اور جس کے ذریعہ مختلف اقوام و ملل کے لوگ ایک دوسرے سے میل جول اور روابط بڑھا سکیں ۔ بعض لوگ عالمی زبان کو قومی اور علاقائی زبانوں کے لئے خطرہ خیال کرتے ہیں ۔ جسطرح ہٹلر نے عالمی زبان اسپرانتو (ESPERANTO) کو جرمنی کی قومی زبان کے لئے خطرہ تصوّر کرتے ہوئے اسے ملک میں خلافِ قانون قرار دیدیا تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ عالمی زبان کسی ملکی قومی یا علاقائی زبان کیلئے خطرہ نہیں ہوگی ۔ جدید لسانیات کے ماہر بوڈمر (BODMER) نے اپنی کتاب " دی لوم آف لینگوئج " (THE LOOM OF LANGUAGE) کے گیارہویں باب میں اس قسم کے تمام فرضی خطرات اور خدشات کی تردید کر دی ہے اور عالمی زبان کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھا ــــ کہ :

"عالمی زبان ہر ملک میں ثانوی زبان کے طور پر رائج ہوگی۔ آج بھی دنیا بھر کے مدارس میں بچے مادری زبانوں کے ساتھ ساتھ لازمی طور پر ایک یا ایک سے زیادہ غیر ملکی زبانوں کی درس و تدریس اور رواج سے کسی ملک اور قوم کی زبان کو خطرہ نہیں تو عالمی زبان کی تعلیم سے خطرہ کیوں ہوگا۔" (کتاب مذکور ص ۴۸۳ - ۴۸۲)

ضرورت کا احساس | اسلام نے روز اول سے ہی عالمی زبان کی ضرورت کا احساس کر لیا تھا، چنانچہ قرآن کریم کی تلاوت، نماز اور خطبات جمعہ و عیدین کیلئے عربی زبان کو بین الاقوامی سطح پر لازمی قرار دیا ہے۔ گویا جس ضرورت کا احساس اہل دنیا نے بعد از خرابی بسیار تجربات کی روشنی میں آج کیا ہے۔ اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے کر لیا تھا۔

اس سے پہلے کہ یہ بتایا جائے کہ کس ملک یا قوم کے لوگوں نے عالمی زبان کی ضرورت کا احساس کب کیا ہے۔ اور پھر اس باب میں کس نوعیت کی کوششوں کو کام میں لایا گیا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان اسباب و علل کی نشاندہی کی جائے جو اس احساس کے محرک ہوئے ہیں۔

مسلمانوں میں عالمی زبان کی ضرورت کا احساس اشاعت اسلام اور وسیع و عریض سلطنت کے نظم و ضبط نے پیدا کیا تھا۔ اموی خلافت کے زمانے میں فتوحات کا سلسلہ پھیل گیا اور اندلس سے سندھ تک کی وسیع مملکت ایک مرکزی حکومت کے تحت چلنے لگی تو ارباب سیاست نے ایک ایسی زبان کی ضرورت محسوس کی جو پورے عالم اسلام میں افہام و تفہیم کا ذریعہ ہوتی۔ چنانچہ عبدالملک بن مروان نے عربی کو پورے عالم اسلام کی سرکاری زبان قرار دیدیا۔ اور کوشش کی کہ مملکت کے مختلف حصوں میں بولی جانے والی علاقائی زبانوں کے دوش بدوش عربی کو رائج اور عام کیا جائے۔

امویوں کے بعد عباسی دور کے خلفاء نے غیر ملکی زبانوں کے عربی میں تراجم کا سلسلہ شروع کیا اور لاطینی، یونانی، عبرانی، فارسی اور سنسکرت زبانوں میں لکھی ہوئی کتابوں کو عربی میں منتقل کر دیا۔ اس طرح ایک آدمی کے لئے صرف عربی کے سیکھ لینے سے مختلف زبانوں میں تصنیف کی گئی کتابوں کا مطالعہ ممکن ہو گیا۔

اسلام ایک تبلیغی اور بین الاقوامی مذہب (دین) ہے۔ مسلمان جہاں کہیں گئے انہیں زبانوں کی مغایرت کا شدت سے احساس ہوا اور جب دیکھا کہ زبانوں کا اختلاف دین کی اشاعت میں حائل ہو رہا ہے تو انہوں نے جابجا درس گاہیں قائم کر کے عربی زبان کی درس و تدریس شروع کر دی اور غیر عرب اقوام کو ثانوی زبان کے طور پر عربی سکھانے میں سہولت کی خاطر عربی زبان کے قواعد

(GRAMMER) کا فن ایجاد کیا۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ عربی قواعد (GRAMMER) کی مستند ترین کتابیں غیر عرب علماء کی تصنیف کردہ ہیں۔

سقوطِ بغداد کے حادثے کے بعد مسلمان سیاسی اقتدار سے محروم ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ مغربی یورپ اور خاص کر برطانیہ اور فرانس نے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ ان ملکوں کے سیاستدانوں نے مذہب کو دنیاوی مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ اور اسکی صورت یہ نکالی کہ عیسائیت کی تبلیغ کے بہانے کم ترقی یافتہ اور پسماندہ ملکوں میں پادری (مبشر) بھیجے اور ان کے پیچھے فوجوں جرنیلوں اور سیاسی شاطروں نے پیش قدمی کی۔ پادریوں نے تبلیغ کے دوران اور جرنیلوں نے فوجی کارروائیوں اور ان کے بعد نوآبادیات میں نظم و نسق کے دوران ایک مشترک زبان کی ضرورت محسوس کی۔ برصغیر پاک و ہند میں رواج اردو۔ کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام اور میرامن دہلوی کے "باغ و بہار" جیسے طویل افسانے انگریز حکمرانوں کے زبان کی ضرورت کے بارے میں اسی احساس کا نتیجہ ہیں۔

سترویں صدی کے شروع تک یورپ میں لاطینی (LATIN) علمی زبان کے طور پر رائج تھی۔ یورپ کے ہر حصے اور قوم میں اسکی درس و تدریس کا اہتمام تھا۔ اس طرح انہیں ایک ایسی زبان حاصل تھی جو اس برِّاعظم کی مختلف اقوام میں افہام و تفہیم کا ذریعہ تھی۔ ایشیا، افریقہ اور امریکہ میں فتوحات اور نوآبادیات کے قیام نے یورپ کے مختلف ملکوں اور طاقتوں کے درمیان رقابت حسد عناد اور مخالفت کے جذبات پیدا کر دئیے۔ اور اس طرح یورپ سرد و گرم دونوں قسم کی خانہ جنگی کا شکار ہو گیا۔ اس خانہ جنگی میں فتح حاصل کرنے کیلئے سیاست دانوں نے اپنے اپنے ملک کے عوام میں نسلی اور ملکی برتری کا جذبہ ابھارنے کی کوشش کی اور ہر ملک کے حکمرانوں نے اپنی قومی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیکر لاطینی (LATIN) کیلئے عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ زبانوں کی دلدل میں پھنس گیا۔

یورپ کے عاقبت اندیش اور خیر خواہ دانشوروں نے محسوس کیا کہ زبانوں کا اختلاف کسی روشن مستقبل کی علامت نہیں، انہوں نے لاطینی کو مشترک اور بین الاقوامی زبان بنائے رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی۔ لیکن لاطینی کی اندرونی خرابی نے ان کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ ایک طرف مقامی زبانوں کی برتری کا عام رجحان اور دوسری طرف لاطینی زبان کی مشکلات دو ایسے امور تھے جنہوں نے اس زبان کے زوال کو یقینی بنا دیا۔ نوجوان نسل نے لاطینی زبان کے

قواعد (GRAMMAR) کے ناقص ہونے پر اعتراض کیا، اور کہا کہ ہمارے پاس اتنا زیادہ وقت نہیں کہ سائنسی علوم کی تعلیم سے پہلے عمر عزیز کا گرانمایہ حصہ لاطینی کے قواعد رٹنے میں صرف کر دیں۔ ظاہر ہے کہ نوجوان نسل کا لاطینی سے فرار ایک قدرتی امر تھا۔ اور ان کے اعتراض کا ان دانشوروں کے پاس کوئی جواب نہ تھا جو لاطینی کو زندہ رکھنے کی کوشش میں تھے۔

آخر یورپ کے بہی خواہ دانشوروں نے لاطینی کی جگہ کسی دوسری زبان کی تلاش شروع کی جسے پورے برّاعظم میں مشترک زبان کی حیثیت سے اپنایا جاتا۔ لیکن اہلِ یورپ کی بدقسمتی کہئے کہ انہیں یورپ میں رائج قومی زبانوں میں کوئی زبان بھی ایسی نہ مل سکی۔ جس میں مشترک زبان ہونے کی صلاحیت ہوتی ــــ

مصنوعی زبانیں | یورپ کے ماہرین لسانیات براعظم میں رائج زبانوں کی صلاحیتوں سے مایوس ہوگئے تو انہوں نے مصنوعی زبان (ARTIFICIAL LANGUAGE) کی تیاری پر سوچنا شروع کیا۔ اس سلسلہ میں یورپ کے ماہرین نے جس قدر محنت کی اسکی تفصیل کا یہ موقع نہیں، البتہ چند بنیادی اور ضروری باتیں یا اشارات ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں:

۱۔ ۱۶۲۹ء میں فرانس کے ایک فلسفی نے جو علم ریاضی کا ماہر بھی تھا پہلی بار مصنوعی زبان کی تیاری کی تجویز پیش کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ایسی زبان بنائی جا سکتی ہے جس کا ذخیرہ الفاظ صرف ایک دن کی محنت سے ذہن نشین ہو جائے۔

۲۔ ۱۶۶۸ء میں بشپ وِلکنز (BISHOP WILKINS) نامی ایک ماہر لسانیات "فلسفیانہ زبان" (PHILOSOPHICAL LANGUAGE) کے عنوان پر ایک مضمون لکھا جس میں فرانس کے مذکورہ بالا فلسفی کے خیالات کی تائید اور اسے عملی جامہ پہنانے کے اقدامات کی وضاحت کی گئی تھی۔

۳۔ ۱۶۶۱ء میں ڈالگرنو (DALGARNO) نام کے ایک عالم لسانیات نے ایک ایسی زبان تیار کی تھی جس کا ذخیرہ الفاظ ریاضی کے اعداد کی طرح آسان اور قابلِ فہم تھا۔ اس نے ایک جیسے معانی کے لئے ایک جیسے کلمات تجویز کئے تھے۔ ہاتھی، گھوڑا، گدھا اور خچر باربرداری کے کام آنے والے چار جانور ہیں جو ایک دوسرے سے کام کی نوعیت کے اعتبار سے تعلق رکھتے ہیں۔ "ڈالگرنو" کی زبان میں ان چاروں جانوروں کے لئے جو کلمات مخصوص تھے وہ بھی آپس میں قریبی ربط رکھتے تھے۔ مثلاً ہاتھی کے لئے "نیکا"، گھوڑے کے لئے "نیکے"، گدھے کیلئے "نیکی" اور خچر کیلئے "نیکو" کا لفظ تھا۔

۴ - ۱۶۶۴ء میں برطانیہ کی رائل سوسائٹی نے انگریزی کی اصلاح کیلئے ایک کمیٹی قائم کی تھی۔ اس کمیٹی کا قیام اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ انگریزی ناقص زبان ہے اور اس میں بین الاقوامی زبان ہونے کی صلاحیت نہیں۔ اس کمیٹی نے کیا سفارشات کیں یا انگریزی کی اصلاح کے سلسلے میں کیا خدمات سرانجام دیں۔؟ اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا، البتہ اس کمیٹی نے " ڈالگرنو" کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ آپ کی تیار کردہ زبان کو عالمی زبان کے طور پر قبول کر لینے کی بادشاہ کو سفارش کی گئی ہے۔

۵ - بشپ ولکنز (BISHOP WILKINS) نے جو زبان مرتب کی تھی اسکی ایک خوبی یہ تھی کہ اس میں دوسری زبانوں کے تراجم یا اس زبان کے دوسری زبان میں ترجمے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کسی ایک زبان کی کتاب کو ولکنز کے تیار کردہ رسم الخط میں لکھ دینے سے اس میں یہ خوبی پیدا ہو جاتی تھی کہ وہ لوگ بھی اس کتاب کو سمجھ سکتے تھے جو اس زبان سے واقف نہیں ہوتے تھے۔ جس میں کتاب لکھی گئی تھی۔ گویا ولکنز نے تلفظ ایجاد نہیں کیا تھا رسم الخط مرتب کیا تھا۔ ولکنز (WILKINS) نے اس ایجاد کا تصوّر ریاضی کے اعداد اور چینی کے رسم الخط سے لیا تھا۔ ریاضی کے اعداد لکھنے والا کسی زبان میں لکھے پڑھنے والا اپنی زبان میں پڑھ لیتا ہے، یہی حال چینی زبان کا ہے۔

چین میں آٹھ مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لیکن یہ سب ایک ایسے مشترک خط میں لکھی جاتی ہیں کہ شمالی چین کی زبان میں لکھی ہوئی کتاب کو جنوبی چین میں رہنے والا وہ شخص بھی پڑھ سکتا ہے جسے شمالی چین کی زبان سے قطعاً کوئی واقفیت نہیں۔ گویا چین کے مختلف حصّوں میں رہنے والے لوگ ایک دوسرے سے بات چیت تو نہیں کر سکتے ہیں۔ سارے چین میں ایک ہی اخبار پڑھا جا سکتا ہے۔ باوجودیکہ سارے چین میں آٹھ مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ دراصل چینیوں کا رسم الخط تصویری رسم الخط کی ایک صورت ہے جو چین کی آٹھ مختلف زبانوں کیلئے مشترک حیثیت رکھتا ہے۔ اور ولکنز نے جو رسم الخط ایجاد کیا تھا وہ ساری دنیا کی زبانوں کیلئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ یا کم از کم ولکنز کا یہ دعویٰ تھا کہ اس کے ایجاد کردہ رسم الخط میں عالمی ہونے کی صلاحیت ہے۔

۶ - ۱۸۷۹ء جرمنی کے ایک دانشور نے جس کا نام "جان مارٹن شیلیر (JOHANN MARTIN SCHLEYER) تھا۔ وَولاپک (VOLAPUK) نام سے ایک زبان ایجاد کی یہ پہلی

خوش نصیب مصنوعی زبان تھی جسے لکھا اور پڑھا گیا اس میں کتابیں تصنیف کی گئیں اور تراجم ہوئے اس زبان کی ایجاد کے صرف دس سال بعد ۱۸۸۹ء میں اندازہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وولاپوک کے حمایتی دو لاکھ سے اوپر تھے ۔ دو درجن رسالے اور تیس سو سے اوپر جماعتیں اس کی نشر و اشاعت میں مصروف تھیں ، وولاپوک کا مقصد اس کے نام اور نعرے سے ظاہر ہے ___ وولاپوک (VOLAPUK) اسی زبان کے دو کلمات سے مرکب ہے ۔ "وولا" (VOLA) یعنی "عالمی" اور "پوک" (PUK) یعنی "زبان" ___ عالمی زبان ___ اس زبان کے حامیوں کا نعرہ (MOTTO) تھا ___ MENADE BAL PUKI BAL ___ FOR ONE HUMANITY) ONE LANGUAGE) یعنی ایک انسانیت کیلئے ایک زبان ۔ افسوس کہ یہ زبان اپنے ہی چاہنے والوں کے باہمی اختلافات کے بعد جس سرعت سے پھیلنی شروع ہوئی تھی ۔ اس سرعت سے ۱۸۸۹ء میں انحطاط کا شکار ہو گئی ۔

۷ ۔ ۱۸۸۷ء میں "وولاپوک" کے زوال سے دو سال پہلے موجودہ زمانے کی مشہور اور کامیاب ترین مصنوعی زبان "اسپرانتو" (ESPERANTO) ایجاد ہوئی اس کے موجد کا نام "زامن ہوف" (ZAMENHOF) تھا جو پولینڈ کا باشندہ تھا ۔ یہ زبان آج تک زندہ اور ترقی پذیر ہے اس وقت امریکہ روس اور چین جیسے باہمی مخالف اور متحارب ملکوں میں بھی اس کے حامی اور اسکی نشر و اشاعت کرنے والے ادارے موجود ہیں ۔ اٹلی کے ایک شخص نے حال ہی میں قرآنِ کریم کا اسپرانتو میں ترجمہ کیا ہے ۔

اسپرانتو (ESPERANTO) کی ایجاد کے بعد بھی بہت سی مصنوعی زبانیں ایجاد کی گئیں ہیں جن میں سپیلین (SPELIN) یونی ورسل (UNIVERSAL) ایدو (IDO) اور اسپرانتیدو (ESPERANTIDO) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ لیکن "اسپرانتو" جیسی کامیابی اور شہرت کسی کو نصیب نہ ہوئی ۔ "اسپرانتو" ایک زندہ اور ترقی پذیر زبان ہے ۔ اس کے مطالعہ سے یورپیائی زبانوں کے انداز اور سٹائل کا پتہ چل جاتا ہے ۔ نیز "سکاوٹ" اور "ریڈ کراس" کی عالمی تحریکوں کی طرح "اسپرانتو" کی تحریک بھی ایک عالمی علمی اور باہمی تعاون کی تحریک ہے ۔ ان حالات میں میری تجویز ہے کہ ہمارے جامعات (یونیورسٹیوں) کے نصاب میں جہاں دنیا کی بہت سی مردہ زبانوں کو اختیاری حیثیت دی گئی ہے ۔ "اسپرانتو" کو بھی اختیاری زبان کی حیثیت دی جائے ۔

بنیادی انگریزی اوپر کی سطور میں یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ ۱۹۶۲ء میں انگریزی کی اصلاح کر کے اسے عالمی زبان بنانے کی کوشش کی گئی تھی ۔ اس وقت تو یہ کوشش ابتدائی مراحل

ہی پر ختم ہوگئی تھی۔ لیکن ۱۹۳۰ء میں ایک انگریز نے از سر نو کوشش کر کے "بنیادی انگریزی" (BASIC ENGLISH) تیار کی، اس میں خوبی یہ ہے کہ ۸۵۰ کلمات پر مشتمل ذخیرہ الفاظ ہے جو چالیس ہزار کلمات کی جگہ استعمال ہو سکتا ہے۔ اور اسکی گرامر کے صرف سولہ قاعدے یاد کرنے پڑتے ہیں۔ اس زبان کی ایجاد یا ترتیب کے بعد ۱۹۴۰ء میں اسکی اشاعت کے لئے باقاعدہ کوشش شروع کی گئی اور آج پاکستان کی افواج میں بھی یہ زبان (بیسک انگلش) رائج ہے۔ اس کا محدود ذخیرہ الفاظ اور چند قواعد پر عبور حاصل کرنے کیلئے تین اور چھ ماہ کی مدت صرف ہوتی ہے۔

انگریزوں کی اس کوشش کے دیکھا دیکھی امریکیوں نے خاص انگریزی (SPECIAL ENGLISH) ترتیب دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریز اور امریکی یہ نہیں چاہتے کہ ان کی زبان انگریزی کے علاوہ کوئی دوسری زبان عالمی زبان کا درجہ حاصل کرے۔ انہیں "اسپرانتو" کی مخالفت کے لئے کوئی دلیل ہاتھ نہیں آئی تو اس کے مقابلے میں بیسک اور سپیشل انگریزی رائج کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے شاید انہیں اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ دنیا انگریزی اور اس کے پرستاروں (انگریزوں اور امریکیوں) کو ٹھکرا چکی ہے۔ اور ان کے اپنے مفکر لارڈ رسل اور ٹائن بی وغیرہ یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ اب عالمی سیاست اپنا رخ بدل رہی ہے۔

> جہاں تک انگریزی زبان کا تعلق ہے اس سلسلہ میں اس زبان کے تمام ماہر بغیر کسی اختلاف رائے کے اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ زبان نہایت بے ربط بے ڈھنگی اور بے لطف ہے، نہ اس میں فرانسیسی یا عربی فارسی جیسی حلاوت اور شیرینی ہے اور نہ ہی اسکی ساخت بناوٹ، سٹائل اور قواعد میں معقولیت ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے اب تک کی معروضات کا خلاصہ ملاحظہ فرمالیں:

۱۔ زبانوں کی کثرت اور بولیوں کا اختلاف عالمی سطح پر انسانوں میں اتفاق اور تعاون کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

۲۔ مختلف ملکی یا قومی زبانوں کے ساتھ ساتھ ایک عالمی یا بین الاقوامی زبان کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے۔

۳۔ اسلام نے عالمی زبان کی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے عربی زبان کو مسلمانوں کیلئے لازمی قرار دیا ہے۔

۴۔ یورپ کے ماہرین لسانیات نے یہ حقیقت تسلیم کر لی ہے کہ لاطینی (LATIN) یا

یورپ میں متعارف کسی دوسری زبان میں عالمی زبان کا درجہ حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں۔

۵- یورپ کے دانشوروں اور ماہرین لسانیات نے مختلف مصنوعی زبانیں ایجاد کیں لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی عالمی زبان کا درجہ حاصل نہ کر سکی سوائے "اسپرانتو" کے جو ابھی تک زندہ اور ترقی پذیر ہے۔

۶- انگریزوں اور امریکیوں نے انگریزی کے ذخیرہ الفاظ کو محدود کر کے اسے عالمی زبان کے طور پر مقبول بنانے کی کوشش شروع کر رکھی ہے۔

(باقی آئندہ)

پروفیسر احمد سعید صاحب ایم۔ اے او کالج لاہور

حضرت تھانویؒ کی تعلیمات

اور
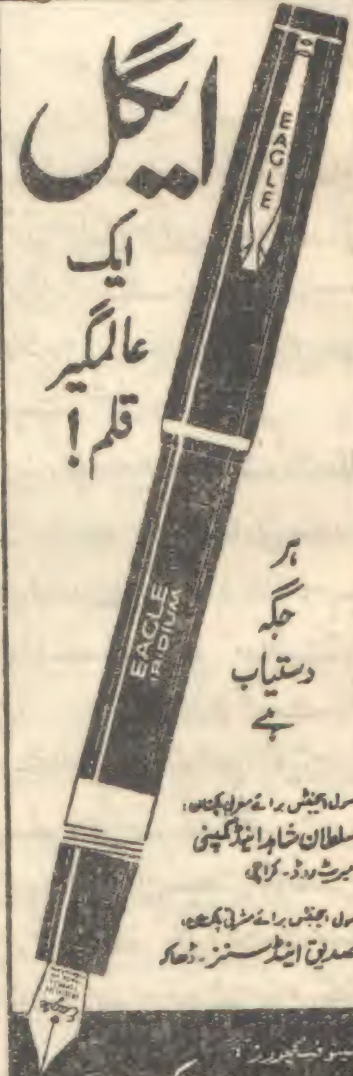
ہمارا معاشرہ

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی زندگی، ملفوظات اور مواعظ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ آپ نے ہمیشہ حقوق العباد کی ادائیگی پر بے حد زور دیا۔ ملفوظات میں جگہ جگہ اس کا تذکرہ ملتا ہے کہ اور مشائخ کے یہاں تو بڑا اور بزرگ بناتے ہیں مگر میرے یہاں انسان بنانے پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ ہمارے معاشرہ میں جو برائیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کے سدّباب کی جانب حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے بہت کوشش کی۔

زمانے کی ستم ظریفی ہے کہ ایک عام تاثر یہ پیدا ہو گیا ہے کہ دین صرف نماز روزہ اور حج کا نام ہے، عملی زندگی سے دین کو ہم نے بالکل خارج کر دیا ہے۔ حضرت تھانویؒ نے اپنے ملفوظات اور مواعظ میں اسی مفروضہ کی بیشمار جگہ تردید کی کہ دین صرف روزہ نماز کا نام ہے۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ معاشرت کو دین کا ایک اہم جزو خیال فرماتے تھے۔ فرمایا: "معاشرت کو تو لوگوں نے دین کی فہرست ہی سے نکال دیا ہے، سمجھتے ہیں کہ روزہ نماز حج زکوٰۃ تلاوت نوافل، بس ان چند چیزوں کے متعلق احکام ہیں، آگے جو چاہیں کرتے پھریں جس کے معنی آجکل آزادی کے ہیں سو خوب سمجھ لو تم کو آزاد نہیں چھوڑا گیا، بلکہ شریعت نے ہماری گفتار رفتار نشست و برخاست لین دین کھانے پینے ہر چیز سے تعرض کیا ہے، شریعت مکمل قانون ہے۔" (الافاضات الیومیہ ج۴ ص۲۰۴)

فرمایا: "آجکل عوام تو کیا خواص بھی سلیقہ کو دین نہیں سمجھتے۔ دین کی فہرست ہی سے خارج کر دیا ہے۔ چند چیزوں کا نام دین سمجھ رکھا ہے، حالانکہ قرآن مجید اور حدیث میں اس کے متعلق کافی تعلیم موجود ہے۔" (الافاضات الیومیہ جلد ۶ ص۲۳۳)

ایک اور جگہ فرمایا: "آجکل معاشرت کو تو دین کی فہرست ہی سے نکال دیا ہے اسکی کوئی

اصل ہی نہیں سمجھتے، حالانکہ احادیث میں الواب کے ابواب معاشرت کی تعلیم میں مدون ہیں۔" ——
(الافاضات حصہ ششم صہ ۳۲۳)

فرمایا: "حسنِ معاشرت کو تو اچھے لکھے پڑھے لوگوں نے بھی دین کی فہرست سے نکال دیا ہے یہ باتیں دین سمجھی ہی نہیں جاتیں۔ محض روزہ، نماز، حج اور چند عقیدوں کو دین سمجھا جاتا ہے۔ آگے صفر۔ حالانکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر دو مسلمان قصداً پاس بیٹھے ہوں محبت کی وجہ سے یا کسی مصلحت کی وجہ سے تو ان کے بیچ میں مت بیٹھو۔ تو جب ایسی ایسی ہلکی باتوں کی نصوص میں تعلیم ہے تو اس سے اندازہ کر لیا جائے کہ دین میں حسنِ معاشرت کی تعلیم ہے کہ نہیں۔" (الافاضات جلد ۴)

حضرت قدس سرہٗ حسنِ معاشرت کو جزوِ شریعت سمجھتے تھے، چنانچہ اس بارہ میں فرمایا:
حسنِ معاشرت کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ لوگوں کو اذیت اور وحشت سے محفوظ رکھے۔ حسنِ معاشرت کا تعلق چونکہ عباد کی اذیت و راحت سے ہے اس لئے وہ بھی جزوِ شریعت ہے اور اصلاحِ معاشرت کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی کو اذیت نہ پہنچائے۔" (فیوض الخالق۔ قسط ہشتم صہ ۲۲)

پابندیٔ وقت یورپ میں لوگوں کے پاس وقت نہیں ہوتا کہ وہ کام کر سکیں لیکن ہمارا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے، وقت کو ضائع کرنا ہمارا قومی شعار بن چکا ہے۔ لیکن ایک دوسری مشکل یہ ہے کہ ہم لوگوں کو پابندیٔ وقت کی اہمیت کا بالکل بھی احساس نہیں ہے۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے اپنی زندگی میں اس طرح کا نظام الاوقات مقرر کر رکھا تھا کہ جن حضرات کو آپ سے ملنے کا اتفاق ہوتا اس کو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اس وقت فلاں کام سرانجام دے رہے ہوں گے اور فلاں کام فلاں مقررہ وقت پر سرانجام دیں گے۔

ایک مرتبہ خود فرمایا "میں نے نظام الاوقات کے سلسلہ میں کبھی کسی کو پریشانی میں نہیں ڈالا۔ جو انتظام ایک دفعہ ہو گیا اس کے خلاف کبھی نہیں کیا۔ اسی واسطے لوگوں کو میری تجویزوں پر اعتماد رہتا ہے۔"

وقت کی قدر و قیمت کے متعلق فرمایا: "بے کار وقت کا کھونا بہت بُرا ہے اگر کچھ بھی کام نہ ہو تو بھی انسان گھر کے کام میں لگ جائے۔ گھر کے کام میں لگنے سے دل بھی بہلتا ہے اور عبادت بھی ہے یہ مجمع میں بیٹھنا خطرے سے خالی نہیں۔"

پابندیٔ وقت کے متعلق فرمایا: "ہر شخص اپنے وقت کا حساب کرے تو ثابت ہو جائے گا کہ نصف سے زیادہ وقت خراب ہوتا ہے۔ وقت کو خراب نہ کیا جائے تو بہت کام ہو جائیں۔

مگر پابندیٔ وقت ہم لوگوں نے ایسی چھوڑی ہے، کہ اب اس کا کرنا نئی بات معلوم ہوتی ہے۔ بعض باتیں قومی شعار ہو جاتی ہیں پھر سب اس کے خلاف کو عیب سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کے لئے تضیع اوقات شعار ہو گئی ہے۔ اب کوئی وقت کی پابندی کرے تو اسکو نکو بنایا جاتا ہے۔" (حسن العزیز ج ۴ ص ۲۹)

مبہم بات | اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ بات واضح طور پر نہیں کرتے بلکہ مبہم بات کرتے ہیں، جس سے سننے والے کو سخت مصیبت اور مشکل ہوتی ہے۔ حضرت تھانوی اس بات کو سخت ناپسند فرماتے تھے کہ مبہم بات کی جائے۔ فرمایا: "کہ تکلفات اور رسومات نے تو معاشرت کا ناس کر رکھا ہے۔ مجھ کو مبہم بات سے ایسی پریشانی ہوتی ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ لوگ زیادہ نہ بولنے کو آداب سمجھتے ہیں، یہ تکلفات ایرانیوں سے سیکھے ہیں۔ مبہم بات بھی سنت کے خلاف ہے ۔۔۔ دیکھیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام کتنا واضح تھا مگر پھر بھی تین تین بار فرماتے تھے۔ چنانچہ دیکھئے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک شخص نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارا۔ آپ نے فرمایا کون ہے، اس نے کہا میں ہوں، آپ نے فرمایا میں میں کیا ہوتا ہے، اپنا نام لو۔ بعض لوگ آتے ہیں کہ اپنا خادم بنا لیجئے، مطلب یہ ہوتا ہے کہ مرید کر لیں، مگر یہ کلام مجمل ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اپنے دامن میں لے لیجئے، اس کا تو مطلب یہ ہونا چاہئے کہ داماد بنا لیجئے۔ مجمل کلام بولنا تہذیب نہیں ہے تعذیب ہے۔" (کمالات اشرفیہ ص ۱۲۶)

فرمایا: میری طبیعت الجھی ہوئی باتوں سے بہت گھبراتی ہے، چاہتا ہوں کہ صاف صاف بات ہو خود بھی صاف بات کہتا ہوں۔ اور دوسروں سے بھی صاف بات کا منتظر رہتا ہوں۔ لوگوں کو صاف بات کہنے کی عادت نہیں۔ اکثر اسی پر میری لڑائی ہوتی ہے۔" (الافاضات جلد ۶ ص ۲۳۴)

صفائی | حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے اپنے ملفوظات میں بیشمار جگہ اس بات کا اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں کی اچھی عادات اور اصولوں کو غیروں نے اختیار کر کے ترقی کر لی ہے اور مسلمانوں نے اپنے ہی اصولوں کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ ان ہی اعلیٰ اصولوں میں ایک عادت صفائی کی بھی تھی۔ فرمایا: "جسقدر غیر مسلم اقوام میں سب نے اسلام کے اصول لے لئے ہیں اور مسلمانوں نے چھوڑ دیئے ہیں۔ پریشان ہیں تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ مدارس میں ایک انگریز مسلمان ہوا مسجد میں نماز کے لئے آیا۔ دیکھا کہ نالی میں صفائی نہ تھی۔ اس پر اس نے خادم مسجد سے کہا کہ ذرا صفائی رکھنا چاہئے۔ تو جاہل لوگوں نے کہا کہ بڑا صفائی صفائی گاتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تو عیسائی ہے۔ گویا مسلمان وہ ہے جس میں صفائی نہ ہو۔ میلا کچیلا رہے۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ لوگوں میں

بالکل حس نہیں رہا۔ دیکھئے حدیث شریف میں آیا ہے کہ نظفوا افنیتکم۔ یعنی گھر سے باہر جو اس کے سامنے میدان ہے اسکو صاف رکھو سو ظاہر ہے کہ جب مکان سے باہر کی صفائی کا اسقدر اہتمام ہے تو خود گھر کی صفائی کس قدر مطلوب ہے۔ (الافاضات الیومیہ جلد ۵ ص ۲۳۷)

بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ دو اشخاص جب معروف گفتگو ہوں تو آکر بیچ میں مصافحہ کرنے لگتے ہیں۔ حضرت تھانوی قدس سرہ کو یہ بات سخت ناپسند تھی، آپ فرماتے تھے کہ اگر دو حضرات مصروف گفتگو ہوں تو آنے والے شخص کو چپکے سے آکر بیٹھ جانا چاہئے۔ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ بیچ میں آکر سلام کر کے لٹھ سا مار دیا اور مصافحہ کرنے لگے یہ بڑی سخت بدتمیزی ہے اور ایذا کا موجب ہے۔ (حسن العزیز ص ۲۲۲)

ایک مرتبہ مغرب کی نماز کے بعد ایک صاحب سے حضرت تخلیہ کی گفتگو فرما رہے تھے۔ ایک صاحب پاس آکر بیٹھ گئے اور کچھ کہنا چاہا۔ حضرت نے فرمایا کہ جہاں دو آدمی بیٹھے تخلیہ کی باتیں کر رہے ہوں وہاں بلا اجازت آکر بیٹھنا شرعاً گناہ ہے، یہ سن کر وہ سلام کر کے چلے گئے۔ فرمایا: یہ لیجئے، کہا یہ تھا کہ اس طرح آکر بیٹھنا گناہ ہے، بس سلام کر کے اٹھ کر چلے گئے۔ یہ نہ ہوا کہ ان کے فارغ ہونے کے بعد مل لیتے۔ اب مجھے بداخلاق کہتے ہوں گے۔ حکم شرعی سے بھی اطلاع نہ کرتا، ایسی خوش اخلاقی تو نہیں کر سکتا۔"

حضرت تھانوی قدس سرہ ہر کام کو انتظام سے کرنے پر بے حد زور دیتے تھے۔ فرمایا: "انتظام بڑی برکت کی چیز ہے۔ ہر کام میں انتظام کی ضرورت ہے اگر میں یہ خاص قواعد اور اصول منضبط نہ کرتا تو اس قدر کام نہ ہو سکتا تھا۔ بہت وقت فضول ضائع اور بیکار ہی جاتا۔ یہ سب انتظام کی برکت ہے اور یہ سب اسلام کی ہی تعلیم ہے۔ مسلمانوں نے اسکو چھوڑ دیا ہے۔ غیر قوموں نے اختیار کر لیا ہے، راحت میں ہیں" (الافاضات الیومیہ جلد ۳ ص ۱۷۲)

گھر میں ایک چیز جہاں سے اٹھاتے تھے اسکو وہیں رکھ دیتے اس سے ایک تو چیز کو تلاش کرنے میں جو ذہنی کوفت ہوتی ہے۔ اس سے بھی بالکل محفوظ تھے، دوسرے وقت کا ضیاع بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس بات کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے فرمایا: "لوگوں کو تو عادت نہیں صفائی اور انتظام کی، الجھی ہوئی طبیعتیں ہیں، میرا تو گھر میں بھی یہی معمول ہے کہ جو چیز جہاں سے اٹھاتا ہوں وہیں خود رکھتا ہوں، مثلاً قلمدان، دیا سلائی گھر میں جہاں سے اٹھاتا ہوں وہیں خود رکھتا ہوں۔ دوسرے پر اس کام کو نہیں چھوڑتا ہوں۔ (الافاضات الیومیہ جلد ۲ ص ۷۹)

ایک مرتبہ کسی چیز کو حضرت قدس سرہٗ نے ایک خاص جگہ رکھا تھا، اٹھانے والے نے دوسری جگہ رکھ دیا۔ ڈھونڈنے میں دقت ہوئی۔ فرمایا: میرے اصول ہیں کہ جہاں سے جو چیز اٹھاؤ اس کو وہیں رکھ دو۔ لوگ کہتے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر سختی کرتا ہے۔ دیکھئے یہ پریشانی ہوتی ہے۔ گو تھوڑی ہی پریشانی ہے، لیکن کوئی کسی مسلمان کو دوسرے کے فعل سے یہ پریشانی ہو، کیا مشکل ہے کہ جو چیز جہاں سے اٹھاؤ وہاں رکھ دو۔" (حسن العزیز جلد اوّل ص ۱۴۲)

حضرت تھانوی قدس سرہٗ اپنی راحت سے زیادہ دوسروں کی راحت اور آسانی کا کسقدر خیال رکھتے تھے اس کا اندازہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے۔ فرمایا: "میں تو یہاں تک خیال رکھتا ہوں کہ لفافہ میں جو خط رکھتا ہوں، اس میں بھی اس کا خیال رہتا ہے کہ کہیں نشیب و فراز نہ رہے، مناسبت کے ساتھ کاغذ موڑ کر رکھتا ہوں، یوں جی چاہتا ہے کہ کسی کو ذرا سی بھی الجھن نہ ہو۔" (الافاضات ص ۲۷۵ ج ۴)

ہم اپنی روزمرہ زندگی میں بار بار اس بات کا تذکرہ کرتے ہیں کہ ہماری آمدنی کم ہے اور خرچ زیادہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے نزدیک اس مسئلہ کا حل یہ تھا کہ جو چیز ہمارے اختیار میں ہے اسکو کم کرنے کی کوشش کریں اور اپنے روپے کو طریقہ سے خرچ کریں، لیکن اس مسئلہ کے سب سے اہم پہلو کی جانب سب سے زیادہ زور دیتے تھے یعنی آمدنی جائز ہو۔ فرمایا: "ہم لوگوں کے کسی کام میں بھی سلیقہ نہیں رہا، کچھ ایسی بے حسی چھا گئی ہے، آمدنی کو دیکھو تو اس میں جائز ناجائز کی پرواہ نہیں۔ خرچ کو دیکھو تو اس میں موقع محل کا کہیں پتہ نہیں، اس کے متعلق میرٹھ کے ایک رئیس زادے نے عجیب بات کہی، کہتے تھے کہ لوگ بڑے بیوقوف ہیں جو چیز غیر اختیاری ہے یعنی آمدنی اسکی تو فکر کرتے ہیں، اور جو چیز اختیاری ہے، یعنی خرچ کم کرنا، اسکی فکر نہیں، بڑے کام کی بات کہی ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ آمدنی مسلمانوں کی کچھ کم نہیں، بشرطیکہ طریقہ سے ضرورت میں صرف کریں تو کبھی پریشانی نہ ہو گی۔" (الافاضات الیومیہ جلد ۲ ص ۶۳۴)

مہمان نوازی مسلمانوں کا ایک مذہبی شعار ہے، لیکن وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ ہم نے اس میں بھی تکلفات اور رسومات کو شامل کر لیا جس سے مہمان نوازی میں بھی بہت خلل پیدا ہو گیا۔ عام طور پر ایک رواج یہ ہو گیا ہے کہ مہمان کے لئے اپنی پسند کا کھانا تیار کیا جاتا ہے حالانکہ ہونا یہ چاہئے کہ مہمان کی پسند کو فوقیت دی جائے۔ مثلاً اگر میزبان مرغ پسند کرتا ہے لیکن مہمان کو چاول پسند میں تو لازمی امر ہے کہ مہمان اس دعوت سے لطف اندوز نہیں ہو سکے گا۔ حضرت تھانویؒ اس بات کو پسند فرماتے تھے کہ مہمان کی مرضی اور اس کے مذاق کے موافق کھانا تیار ہونا

چاہیئے ۔ فرمایا: "خدا جانے یہ رواج کیا ہے کہ مہمان کے لئے کھانا اپنے مذاق اور خواہش کے موافق پکاتے ہیں حالانکہ موٹی سی بات ہے کہ جب اس سے خوش کرنا مقصود ہے مہمان کا تو اس کے مذاق کے موافق ہونا چاہیئے ورنہ اسکی خوشی تو نہ ہوئی ۔ یہ تو اپنی خوشی ہوئی ۔ فرض کرو کسی کو چاول نقصان دیتے ہیں، تو کیا یہ انسانیت ہے کہ چاول اسکو ضرور کھلائے جائیں ۔ اگر اسکو چاول سے نقصان ہوا تو یہ کیا مہمانی ہوئی ۔ مگر رسوم ایسے غالب آئے ہیں کہ اسکی کچھ پرواہ نہیں ۔ میرے نزدیک مہمان کو وہی چیز کھلانی چاہیئے جو اسکو مرغوب ہو لیکن ایسا نہیں کیا جاتا" (حسن العزیز جلد ۴ ص ۱۹۹)

لیکن مہمان نوازی کے بارہ میں حضرت قدس سرہٗ کو یہ بات بالکل ناپسند تھی کہ مہمانوں کی فوج ہی میزبان کے گھر پہنچ جائے ۔ چنانچہ فرمایا: "آجکل معاشرت تو اس قدر خراب ہوگئی ہے کہ اسکی قطعاً کوئی پرواہ نہیں کی جاتی کہ ہماری اس بات سے کسی دوسرے کو تکلیف پہنچے گی یا اسکی پریشانی کا سبب ہوگا ۔ اب مہمان داری ہی کو لیجئے، گاڑیاں، چھکڑے بھر بھر کر میزبان کے گھر پہنچ جاتے ہیں ۔ نہ یہ کہ اس غریب کے گھر کھانے کو ہے یا نہیں خصوصی طور پر کسی کی بیماری یا موت کے موقع پر تو ایسا کرنا بہت ہی ظلم اور بے رحمی کی بات ہے۔" (الافاضات الیومیہ جلد ۳ ص ۱۷۰)

بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ میزبان نے کھانا ختم کر دیا ہے لیکن مہمان کی بھوک ابھی ختم نہیں ہوئی ہے ۔ چنانچہ مہمان بیچارے کو بھی اپنا کھانا ختم کرنا پڑتا ہے ۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے اس بات کو بھی واضح کیا کہ مہمان کے ساتھ ساتھ کھانا چاہیئے تاکہ مہمان کو اکیلے کھانے پر شرمندگی نہ ہو ۔ فرمایا: لوگوں نے معاشرت کے متعلق تو سوچنا چھوڑ دیا ہے ۔ شریعت نے طرزِ معاشرت کو نہایت مکمل بنایا ہے ۔ (مقالاتِ حکمت ص ۱۲۷)

■■

قبرص میں کیا ہو رہا ہے؟

بحیرہ روم کا تیسرا بڑا جزیرہ قبرص ہے، جسے اہلِ عرب قُبرُص اور اہلِ یورپ سائپرس (CYPRUS) کہتے ہیں۔ قبرس عربی زبان میں تانبے کی ایک قسم کا نام ہے جو اس جزیرے میں بکثرت ملتی ہے۔ اسی نسبت سے جزیرے کو موسوم کر دیا گیا۔

قبرص تین براعظموں افریقہ، ایشیا اور یورپ کا سنگم ہے۔ ترکی سے چالیس میل جنوب میں شام کی بندرگاہ انطاکیہ سے ساٹھ میل مغرب میں اور ایشیائے کوچک کی راس انامور سے صرف چھیالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے، قبرص کا کل رقبہ ۳،۵۷۲ مربع میل ہے۔ جزیرے کی شرقاً غرباً لمبائی ایک سو چالیس میل اور شمالاً جنوباً چوڑائی ساٹھ میل ہے۔ آبادی پانچ لاکھ پچاس ہزار نفوس پر مشتمل ہے، جس میں ترک اور یونانی قبرص اہم اجزاء ہیں۔ محدود سی مقدار آرمینی باشندوں کی ہے۔

قبرص ایک عرصے سے صلیب و ہلال کی رزمگاہ بنا ہوا ہے۔ تاریخی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ قبرص میں ۴۰۰۰ تا ۳۰۰۰ ق م میں عہدِ متاخرہ حجری کے لوگ (NEOLITHIC) آباد تھے۔ بعد ازاں مصری، یونانی اور فنیقی اقوام یہاں آباد ہوتی رہیں۔ اور جزیرہ حسن کی دیوی الیفروڈائٹ (APHRODITE) کے لئے مشہور ہو گیا۔ ایک عرصہ شامیوں کے زیرِ تسلّط رہنے کے بعد ۵۶۸ ق م میں مصر نے جزیرے پر قبضہ کر لیا اور پھر ۵۲۵ ق م میں جزیرے پر ایرانیوں کی حکمرانی قائم ہو گئی۔ ۳۳۳ ق م میں سکندرِ اعظم نے ایرانیوں سے جزیرہ آزاد کر لیا۔ سکندر کی وفات (۳۲۳ ق م) کے بعد مصر کا بطلیموس اوّل حکمران بنا۔ اور ۵۸ ق م میں جزیرہ سلطنت روما کا ایک حصّہ بن گیا اور

اسی دور میں یہاں عیسائیت نے برگ و بار پھیلائے اور عوام نے عیسائیت کو اپنایا۔ سلطنت روما کے زوال کے بعد جزیرے پر سات سو سال سے زیادہ عرصہ بازنطینی اقتدار قائم رہا۔ اگرچہ عربوں نے اس دور میں کئی حملے کئے[۱]۔

۵۶۱ء میں عرب کے ریگستانوں میں چشمہ توحید پھوٹا اور عربوں کو ایک نئی قوت اور تازہ ولولے سے سرشار کر دیا۔ عرب جو باہمی لڑائی جھگڑوں میں اپنی صلاحیتیں اور قوتیں ضائع کر رہے تھے۔ انہوں نے ان صلاحیتوں کو عظمت اسلام کے لئے وقف کر دیا۔ تیرہ سال بعد مسلمانوں کی آزاد مملکت مدینہ وجود میں آگئی۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں مربع میل پر پھیل گئی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت راشدہ کا سنہری دور شروع ہوا۔ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے زمانے (۱۳ھ / ۶۳۴ء — ۲۴ھ / ۶۴۵ء) میں بازنطینی سلطنت کو مسلمانوں کے مقابلے میں پے در پے شکستیں ہوئیں اور بحیرہ روم کے جنوبی حصے پر مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔ اس نئی صورت حال کے پیش نظر بازنطینی حکومت کو مملکت کے مشرقی حصے کی ترقی و استحکام کے لئے بحیرہ روم کے شمالی علاقے کی طرف توجہ دینی پڑی۔ چنانچہ بازنطینی سلطنت نے اپنی پوری قوت قسطنطنیہ پر مرکوز کر دی۔

حضرت یزیدؓ بن ابی سفیانؓ (گورنر شام) کے انتقال کے بعد ان کے بھائی حضرت معاویہؓ شام کے گورنر بنائے گئے تو انہوں نے بازنطینی سلطنت کی پالیسی کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی کہ اس وقت تک بازنطینی فوجوں کا ناکہ بند نہیں کیا جا سکتا جب تک مضبوط بحری قوت نہ ہو۔ بازنطینی فوجیں بحری راستے سے آکر بآسانی ساحل پر اتر جاتی تھیں، لیکن مسلمان بحریہ نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان اس سہولت سے محروم تھے۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ نے مرکزی خلافت سے بحری فوج اور بحری بیڑہ مرتب کرنے کی درخواست کی لیکن حضرت عمرؓ نے اجازت نہ دی، کیونکہ خشکی پر مسلمان فوجیں ہر چہار طرف مصروف جہاد تھیں اور حضرت عمرؓ نیا بحری محاذ کھولنے پر رضامند نہ تھے۔

حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد ۲۴ھ / ۶۴۵ء میں حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو حضرت معاویہؓ نے اپنی دیرینہ خواہش کا اظہار کیا۔ دربار خلافت سے اجازت مل گئی۔ بیڑے کی تیاری کے بعد بحیرہ روم کے جزیرے قبرص پر ۲۷ھ / ۶۴۷ء میں حملہ ہوا۔ اس حملے میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ کئی جلیل القدر صحابہ نے شرکت کی تھی جن میں حضرت ابوذر غفاریؓ، عبادہؓ بن صامت، مقدادؓ

اور ابو الدرداء رضوان اللہ علیہم اجمعین شامل تھے۔ خاصی تعداد میں عورتوں نے بھی حصّہ لیا تھا۔ حضرت معاویہؓ کی زوجہ فاختہ بنت قرظہ اور خواہر نسبتی کتوہ بنت قرظہ نے بھی شرکت کی تھی۔ کتوہ اس حملے میں دشمنوں کے ہاتھوں شہید ہو گئی تھیں۔[۲] عبادہؓ بن صامت کی اہلیہ حضرت ام حرامؓ بنت ملحان ضعیفی اور نقاہت کے باوجود شریک ہوئی تھیں۔ اس جذبہ و جوش جہاد کی محرک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیش گوئی تھی جسے بخاری و مسلم نے بایں الفاظ لکھا ہے:

یقول اول جیش من امتی	میری امت کا پہلا لشکر جو بحری جہاد کرے گا
یغزون البحر قد اوجبوا۔	اس کے لئے جنّت واجب ہوگئی حضرت
قالت ام حرام قلت یا رسول اللہ	ام حرامؓ نے عرض کیا (دعا فرمائیے) میں ان
انا فیھم قال انت[۳] الخ	میں ہوں، فرمایا تو ان میں سے ہے۔

اس حملے سے واپسی پر حضرت ام حرامؓ خچر سے گر کر شہید ہو گئیں اور انہیں وہیں دفن کر دیا گیا۔ آج بھی ان کا مزار "لارناکا" کی نمکین جھیل کے کنارے خاص و عام کا مرجع ہے۔ ساتھ ہی ایک مسجد ہے جو بحری راستے سے آنیوالوں کو دور ہی سے دکھائی دینے لگتی ہے۔

اس حملے کے بعد ۲۸ھ / ۶۴۸ء میں اہل قبرص نے جزیہ پر صلح کر لی۔ ان کی پیشکش یہ تھی کہ خلافت اسلامیہ کو سات ہزار دو سو دینار سالانہ خراج ادا کریں گے۔ نیز اتنی ہی رقم بازنطینی سلطنت کو بھی دیں گے۔ حضرت معاویہؓ نے اسکی اجازت دیدی۔ معاہدہ میں یہ بھی طے پایا کہ اگر پشت کیطرف سے ان پر حملہ ہو تو مسلمانوں پر ان کی امداد ضروری نہ ہوگی اور اگر بازنطینی سلطنت مسلمانوں کے خلاف پیش قدمی کرے گی تو اسکی اطلاع دیں گے۔ نیز مسلمانوں کی افواج کو ہر ممکن سہولت بہم پہنچائیں گے۔

بعض اہل تصنیف نے اس مہم کو فتح قبرص سے تعبیر کیا ہے، حالانکہ معاہدے سے قبرص کو ایک نیم آزاد ریاست کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ بازنطینی اثرات کم ہو گئے اور مسلمانوں کو بحیرہ روم میں ایک موزوں اڈہ مل گیا تھا۔ اور باہمی معاہدے سے اسلامی سلطنت کی بالادستی مان لی گئی تھی۔ تاریخ کے طالب علم کے لئے یہ امر موجب حیرت ہے کہ نوزائیدہ ابھرتی ہوئی بحریہ نے خاطر خواہ کامیابی حاصل کی اور بازنطینی قوت کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کامیابی میں مسلمان صحابہؓ کی عزیمت اور دعائیں شامل تھیں۔

اگرچہ معاہدے کی رُو سے اہل قبرص کو غیر جانبدار ہونا چاہیئے تھا، لیکن ۳۲ھ میں انہوں

نے مسلمانوں کے خلاف بازنطینیوں کی امداد کی۔ حضرت معاویہؓ نے اگلے سال ۳۳ھ میں پانچ سو جہازوں کے بحری بیڑے سے حملہ کیا۔ اہلِ قبرص کو دوبارہ صلح کی درخواست کرنا پڑی جسے مسلمانوں نے دوبارہ شرفِ قبولیت بخشا۔ لیکن آئندہ خطرات کے پیشِ نظر ایک فوجی یونٹ بھی متعین کر دیا گیا۔[۴] بلاذری کے بیان کے مطابق بارہ ہزار عربوں کو قبرص میں آباد کیا گیا۔ تاکہ مسلمانوں کی آبادی قائم ہونے سے دیرپا اثرات مرتب ہوں۔ چنانچہ مسلمانوں کی سکونت سے اسلامی تہذیب و تمدن نے اہلِ قبرص پر اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا اور اسلامی ثقافت کی آئینہ دار مساجد اور مکاتب قائم ہو گئے۔

حضرت معاویہؓ کے بعد یزید نے قبرص میں متعین دستوں کو واپس بلا لیا[۵] جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مقامی آبادی نے مسلمانوں کو غیر محفوظ دیکھتے ہوئے ان پر چڑھائی کر دی۔ کثیر تعداد میں مسلمان مارے گئے کچھ جان بچا کر شام چلے آئے۔

عبدالملک بن مروان ۶۵ھ/۶۸۵ء میں برسرِ اقتدار آیا تو اس نے اہلِ قبرص کی سازشانہ روش کے پیشِ نظر تجدیدِ معاہدہ کا مطالبہ کیا۔ بازنطینی سلطنت کی شہ پر قبرصی ابھی تک مسلمانوں کے خلاف سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے لیکن عبدالملک کے کڑے انتظامِ سلطنت اور قوت و حشمت کے پیشِ نظر اہلِ قبرص نے خراج میں اضافہ منظور کر لیا اور از سرِ نو معاہدہ ہوا۔ ولید ثانی کے دور میں ۱۲۵ھ (۷۴۳ء) میں مستقل طور پر قبرص کا شام سے الحاق کر دیا گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اموی حکومت کے خلاف زیرِ زمین عباسی تحریک چل رہی تھی —— دوسری طرف اموی سلاطین بھی جہاں بانی سے منہ پھیر چکے تھے۔ بالآخر عباسی تحریک کامیاب ہوئی اور اموی سلطنت کے کھنڈرات پر عباسی سلطنت کی عمارت اٹھی۔ ایک خاندان کے ادبار اور دوسرے خاندان کے عروج کے درمیانی عرصے سے فائدہ اٹھا کر بازنطینی قوت کام کر گئی اور ایک بار پھر قبرص بازنطینی جھنڈے کے نیچے آ گیا۔ قسطنطنیہ اس کا مضبوط ترین مرکز تھا۔ صقلیہ اور قبرص کو بطور آلۂ کار استعمال کیا جا رہا تھا جس سے اسلامی سلطنت کی شمالی سرحدات مستقل طور پر خطرے میں پڑ گئی تھیں۔

ہارون الرشید کے عہد تک عباسی سلطنت نے استحکام حاصل کر لیا تھا اور اس کے عہد میں شام کے اختیارات حمید بن معیوف ہمدانی کو دیئے گئے۔ اس نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد قبرص پر حملے کا پروگرام بنایا۔ دربارِ خلافت سے اجازت لیکر حمید نے ۱۸۰ھ میں حملہ کیا۔ قلیل محاصرے کے بعد قبرص کے اسقف نے ہارون الرشید کے ساتھ صلح کر لی۔

ہارون الرشید سے صلح کے معاہدے کے باوجود بازنطینی سلطنت کے پروردہ عناصر مسلمانوں کو چین سے بیٹھنے نہ دیتے تھے اور آئے دن عہد شکنی کرتے رہتے تھے۔ ہارون الرشید کے جانشین امین الرشید نے شام و جزیرہ اور سرحدی علاقوں کا والی نامور سپہ سالار عبدالملک بن صالح کو بنایا۔ اس نے قبرص پر بڑے پیمانے پر ایک فیصلہ کن حملے کا پروگرام بنایا لیکن اس سلسلے میں دینی راہنمائی حاصل کرنے کے لئے اس نے لیث بن سعدؒ [6]، مالک بن انسؒ [7]، سفیان بن عیینہؒ [8] موسیٰ بن اعینؒ [9]، اسمٰعیل بن عیاشؒ [10]، یحییٰ بن حمزہؒ [11]، ابواسحاق فرازی اور مخلد بن حسینؒ [12] سے استفسار کیا کہ "ایسا علاقہ جس کے باشندے مسلمانوں سے معاہدہ کرنے کے بعد مسلسل عہد شکنی کرتے ہوں، کیا ان کے علاقوں پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔" متذکرہ الصدر فقہاء کے جوابات امام ابو عبیدؒ (م ۲۲۴ھ) نے کتاب الاموال میں نقل کئے ہیں۔ ابو عبید ہی سے ان کے شاگرد البلاذری نے "فتوح البلدان" میں نقل کئے ہیں۔

زیادہ تر فقہاء کی رائے یہ تھی کہ عہد شکنی کے باوجود ان سے مجموعی طور پر جنگ نہ کی جائے اور معاہدہ کو نباہا جائے۔ تاہم ایک دو فقہاء نے جنگ کا مشورہ بھی دیا۔ اسلامی حکومت کی خیر خواہانہ روش کے باوجود بازنطینی اثرات بڑھتے رہے۔ ایک انگریز دلبرڈ نے ۷۲۲ء میں قبرص کی سیاحت کے بعد درج ذیل تاثرات لکھے:

"قبرص اس وقت عرب اور بازنطینی نفوذ کے درمیان کشمکش کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ جزیرے میں مسلمانوں کے استقرار کو ختم کرنے کے لئے بحری بیڑے نے بھرپور قوت استعمال کی ہے تاہم اسے شکست کا ہی سامنا کرنا پڑا۔"

اس سازشانہ روش کے باوجود اہل قبرص کا کثیر حصہ معاہدہ کا پابند رہا لیکن جب اضمحلال پیدا ہوا تو علیحدگی کے آثار جنم لینے لگے۔ مجموعی طور پر یہ سارا عرصہ صلح و معاہدہ کا دور رہا۔

۹۶۵ء میں اہل قبرص نے معاہدے کو توڑ کر بازنطینیوں کی صدیوں پرانی آرزو کو پورا کر دیا۔ مسلمانوں سے تیر و سناں جا چکا تھا اور چنگ و رباب کا دور دورہ تھا۔ اس پر مستزاد طوائف الملوکی۔ چنانچہ قبرص مسلمانوں کے ہاتھوں سے کلیتہً نکل گیا۔ مسلم آبادی کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا اور تقریباً چھ صدیوں تک یہ خطۂ زمین اسلام کے اثر سے خالی رہا۔ اس دور میں روم کی تہذیب کا سکّہ رواں رہا اور مسلمانوں کی یادگاروں کو ایک ایک کر کے مٹا دیا گیا۔

(۳)

قبرص پر بازنطینی قبضہ قائم تھا کہ ۱۱۹۱ء میں رچرڈ اوّل شاہ انگلستان، سلطان صلاح الدین

ایوبیؒ کے مقابلے میں صلیبی جنگوں میں شرکت کے لئے آیا تو راستے میں قبرص کے بازنطینی حکمران سے جھڑپ ہوگئی۔ رچرڈ نے حملہ کر کے قبرص پر قبضہ جما لیا اور ۱۱۹۲ء میں اس نے قبرص فرینک خاندان کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس طرح بازنطینی اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔ بعد ازاں تقریباً چار سو سال فرینک خاندان حکمران رہا، اس خاندان کے حکمرانوں میں پطرس اوّل اپنی اسلام دشمنی کے لئے خاصا معروف ہے۔ اس نے اسلامی آثار کو مٹانے کی بھرپور کوشش کی مگر — ع

لکھا ہے ہم نے "نام" کہ مٹایا نہ جائے گا

پطرس کے جانشین شاہ جانوس نے مصر کے مملوک سلاطین کو مکمل طور پر ختم کرنے کی بھرپور تیاریاں شروع کر دیں۔ چند ایک ابتدائی جھڑپوں کے بعد ۱۴۲۶ء میں مملوک سلاطین نے ۱۸۰ جہازوں کے بیڑے سے قبرص پر حملہ کیا۔ گھمسان کی جنگ کے بعد جانوس کو شکست ہوئی۔ جانوس گرفتار ہوگیا اور آٹھ ماہ تک مملوک سلاطین نے قید رکھا اور خراج کے وعدے پر رہائی پائی۔ قبرص کی اس تباہ کن شکست کے بعد مملوک سلاطین کو قبرص کیطرف سے اطمینان ہوگیا۔ چنانچہ یوسنان کے دورِ آخر تک کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔

پندرہویں صدی کے آخر میں ترک نئی قوت بن کر ابھرے اور ان کے ہلالی پرچم یورپ کے ساحلوں پر لہرانے لگے۔ اس خطرے کو سب سے پہلے وینس کے حکمرانوں نے محسوس کیا۔ ترکوں کا راستہ روکنے کے لئے ان کی نظر بھی قبرص پر ہی پڑی۔ قبرص کی برائے نام حکومت کسی بھی وقت ترکی کے ہاتھ میں جا سکتی تھی۔ چنانچہ اہلِ وینس نے ۱۴۸۹ء میں قبرص پر تسلط قائم کر کے ترکوں کا راستہ روکنے کیلئے حفاظتی بند باندھ دیا۔ ان لوگوں نے قبرص کو اپنی تہذیب میں رنگنے کی بجائے فوجی پہلو پر زیادہ توجّہ دی۔ اور ان کے دور میں قبرص ایک فوجی اڈہ بن گیا۔ تاہم ترکوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے سامنے یہ اڈہ بھی ریت کی دیوار ثابت ہُوا اور ۱۵۷۱ء میں ایک بار پھر اسلام کی نورانی شعاعوں سے قبرص منوّر ہوگیا۔

(۴)

ترکوں کے اقتدار سے قبرص کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ ۱۵۷۱ء میں جب آلِ عثمان نے قبرص کو اہلِ وینس سے آزاد کرایا تو یہ جزیرہ اسلامی نظامِ زندگی کی نعمتوں سے مالا مال ہوگیا۔ ظلم و عدوان کی بجائے امن و عدل کی بہار آگئی۔ خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ ہوگیا۔ معاشرتی اونچ نیچ حرفِ غلط کی طرح مٹادی اور ترکوں کی رواداری اور مروّت نے اہلِ قبرص

کے دلوں میں ان کے لئے احترام کے جذبات پیدا کر دئے۔ ترکوں نے اقتدار حاصل کرتے ہی دو اہم اقدامات کئے۔ اوّلاً پورے جزیرے میں غلامی کو ممنوع قرار دیدیا اور غلاموں کو معاشرے میں مساوی مقام دلایا۔ ثانیاً آرتھوڈکس کلیسا (ORTHODUX CHURCH) کو بحال کر دیا۔ جسے کیتھولک کلیسا نے بد دین قرار دے کر منسوخ کر دیا تھا۔[۱۱] قبرص کی مسیحی آبادی کو اپنے پرسنل لاء کے مطابق مقدمات کے فیصلے کرنے اور اپنی مذہبی روایات کو انجام دینے کی مکمل آزادی دیدی گئی۔ اس طرح قبرص کی مسیحی آبادی کو پہلی بار مغرب کے آمریت پسند مسیحی راہنماؤں سے نجات دلائی۔ ولیم ٹرنر ان ہی اصلاحات کو دیکھتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"قبرص پر بظاہر "بے" حکمران ہے لیکن درحقیقت یہاں یونانی اسقف اور اس کے ماتحت پادریوں کی حکومت ہے۔"

۱۸۳۹ء میں سلطنت عثمانیہ کی طرف سے قبرص میں آئینی اصلاحات رائج ہوئیں۔ قبرص میں ایک قائم مقام مقرر کیا گیا جس کی معاونت کے لئے مقامی آبادی سے ایک انتظامی کونسل بنائی گئی۔ اس طرح قبرص کو داخلی معاملات میں خود مختاری دیدی گئی۔

تین صدیوں تک قبرص پر اسلام کا ہلالی پرچم لہراتا رہا۔ آخر انیسویں صدی کے اواخر میں بین الاقوامی سطح پر دور رس تبدیلیاں عمل میں آنے لگیں۔ نہر سویز کی بدولت یورپ کے لئے بحیرہ عرب کی اہمیت بڑھ گئی۔ اور عالمی طاقتوں کی نگاہ اس علاقے پر جم گئی۔ روس درۂ دانیال اور آبنائے فاسفورس پر تسلط جمانا چاہتا تھا جس کے لئے اُسے سلطنت عثمانیہ سے ٹکرانا ضروری تھا۔ اس مقصد کے لئے روس نے جزیرہ قبرص پر قابض ہونا فوجی مقاصد کیلئے موزوں سمجھا۔ برطانیہ جو اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لئے کوشاں تھا، اس نے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مداخلت کی اور سلطان کو پیشکش کی کہ اگر سلطنت عثمانیہ قبرص کی عملداری برطانیہ کو دیدے تو وہ روسی اثر و نفوذ کو ختم کرنے میں سلطان کی امداد کرے گا۔ سلطان نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ چنانچہ جون ۱۸۷۸ء میں دفاعی معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ معاہدے کی رُو سے یہ طے پایا کہ قبرص کے نظم و نسق کی ذمہ داری برطانیہ پر عائد ہو گی۔ مگر قانونی طور پر یہ جزیرہ سلطنت عثمانیہ ہی کا جزو تصوّر کیا جائے گا۔

برطانوی دورِ اقتدار میں یہودی قوم نے جزیرہ میں معاشی ذرائع پر تسلّط حاصل کیا اور جزیرے کو بین الاقوامی تجارتی اڈے میں بدل ڈالا۔ اس عرصے میں یونانیوں اور یہودیوں کو باہر سے لا کر آباد کیا گیا۔ مسلمانوں کے اثر و رسوخ میں دن بدن کمی آتی گئی اور عملاً جزیرہ سلطنت عثمانیہ سے کٹ گیا۔

برطانوی نظم و نسق کے باوجود قبرص کے مسلمان ہمیشہ اپنے آپ کو ترکی سے منسلک سمجھتے رہے۔ ۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی مرحوم نے روم اور ترکی کا سفر کیا۔ ۱۷ مئی ۱۸۹۲ء کو ان کا جہاز قبرص پہنچا۔ سفرنامے میں لکھتے ہیں کہ:

پندرہ سولہ برس سے انگریز یہاں حکومت کر رہے ہیں، لیکن حکمتِ عملی کے لحاظ سے طرزِ انتظام میں بہت سی قدیم باتیں قائم رکھی ہیں۔ محکمہ قضا بالکل الگ ہے اور شرعی مقدمات سے حکومت انگریزی کو کچھ واسطہ نہیں۔ اتفاق سے مجھ کو قاضی صاحب سے بھی نیاز حاصل ہوا۔ بہت خلیق و باوقار آدمی تھے۔ تعلیم کا طریقہ بھی بالکل ترکی انتظام کے مطابق ہے۔ تمام مکتبوں اور مدرسوں میں ترکی سررشتۂ تعلیم کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں[۱۴]

ترکی اثرات کا یہ عالم تھا کہ جزیرے بھر میں ترکی زبان کی حکمرانی تھی۔ بلا امتیاز مذہب عوام ترکی زبان ہی کو وسیلۂ اظہار بناتے تھے۔ علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں:

یہاں کی زبان ترکی ہے اور یہاں سے قسطنطنیہ تک ہر شہر اور قصبہ کی یہی زبان ہے۔ اس سے ترکوں کی حکومت اور سطوت کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ممالک مفتوحہ کی زبان تک بدل دی۔ ایشیائے کوچک اتنا وسیع ملک ہے اور کثرت سے عیسائی آباد ہیں۔ جن کی زبان کسی زمانے میں یونانی یا لیٹن (لاطینی) تھی لیکن اب تمام ملک میں ترکی بولی جاتی ہے[۱۵]

جنگِ عظیم اوّل میں ترکی محوری طاقتوں میں شامل تھا اور برطانیہ نے جنگ چھڑنے پر قبرص کو مکمل طور پر اپنی قلمرو میں شامل کر لیا اور سلطنتِ برطانیہ کی طرف سے یہاں ہائی کمشنر مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۲۴ء کی لوزان کانفرنس میں ترکوں نے بھی مجبوراً اس انضمام کو تسلیم کر لیا۔ اور اعلان کر دیا کہ "قبرص تاجِ برطانیہ کا مقبوضہ ہے۔"

جنگِ عظیم اوّل کے بعد جب برطانیہ نے قانونی طور پر قبرص کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تو ترکی نے مجبوراً اسے تسلیم بھی کر لیا۔ تاہم قبرص کے ترک مسلمانوں نے غلامی کا جوا گلے میں ڈالنے سے انکار کر دیا اور تحریکِ آزادی کی داغ بیل ڈال دی۔ عیسائی آبادی بھی اس جدوجہد میں شامل ہو گئی۔ مگر اس کے پیشِ نظر کچھ دوسرے ہی مقاصد تھے۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد برطانیہ کے خلاف بغاوتوں کا آغاز ہوا۔ یونان نے ان بغاوتوں کی درپردہ امداد کی تاکہ کامیابی کی صورت میں جزیرے کا یونان سے الحاق کیا جا سکے۔

یونانی قبرصیوں کے فاسد مقاصد کے پیشِ نظر ترک قبرصیوں اور ان کے درمیان لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔ عیسائی قبرصیوں نے مسلم اقلیت کو تہ تیغ کرنے اور ان کی نسل کشی کی مہم چلادی اور اس طرح قبرص میں ایک بار پھر صلیب و ہلال کی جنگ شروع ہو گئی۔ (باقی آئندہ)

حوالہ جات و حواشی

۱۔ انسائیکلو پیڈیا امریکانا جلد ۸ لفظ "CYPRUS"
۲۔ فتوح البلدان۔ البلاذری ترجمہ ابو الخیر مودودی۔
۳۔ صحیح بخاری کتاب الجہاد۔ ما قیل فی قتال الروم
۴۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ CYPRUS
۵۔ فتوح البلدان۔
۶۔ لیث بن سعد (م ۱۷۵ھ) آپ مصر کے قاضی اور مفتی تھے۔
۷۔ مالک بن انس (م ۱۷۹ھ) صاحبِ مؤطا۔
۸۔ سفیان بن عینیہ مکہ کے بڑے فقیہہ تھے۔
۹۔ موسیٰ بن اعین (م ۱۷۷ھ) آپ عراق کے فقہاء میں سے تھے۔
۱۰۔ اسمٰعیل بن عیاش مفتی شام تھے۔
۱۱۔ یحیٰی بن حمزہ قاضی دمشق تھے۔
۱۲۔ ابو اسحاق فرازی اور مخلد بن حسین دونوں فقہاء سرحدی علاقوں میں مقیم تھے۔
۱۳۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا ج ۶ ص ۹۵۳
۱۴۔ سفر نامہ روم و مصر و شام ص ۴۴
۱۵۔ ایضاً ص ۴۵۔

ملفوظات شاہ فضل علی قریشیؒ

حسن بصریؒ کی دعاؤں سے سود خوار ولی اور عارف بن گیا

خواجہ فضل علی شاہ قریشی مسکین پوری کئی ایک مشائخ نقشبندیہ اور حضرت مولانا عبدالغفور صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے پیر و مرشد ہیں۔ یہ غیر مطبوعہ ملفوظات راقم الحروف کے والد بزرگوار حضرت خواجہ محمد نور بخش صاحبؒ ساکن چھلن شریف جو صاحب ملفوظات کے اکابر خلفاء میں سے ہیں، کے جمع کردہ ہیں۔ (عبدالرشید چھلن شریف)

مجلس اول | فرمایا: حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو جب عروج حاصل ہوا تو تمام اطراف سے خلقِ خدا زیارت کرنے اور فیض حاصل کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگی۔ آپ کا ایک پڑوسی تھا، جو بڑا سود خوار تھا۔ اسکی سود خواری کی کوئی حد نہ تھی۔ مقروض کے پاس جاتا۔ اگر مقروض قرضہ ادا نہ کر سکتا تو آنے جانے کا کرایہ اس سے وصول کر لیتا۔ ایک روز وہ ایک بڑھیا کے پاس اپنا قرضہ وصول کرنے گیا، بڑھیا نے عذر پیش کیا کہ انہیں مہلت دی جائے۔ کیونکہ تین دن سے وہ بھوکے بیٹھے ہیں۔ آج ایک شخص نے بکری کی سری بھیجی ہے، اس کے سوا گھر میں اور کوئی چیز نہیں، اس سے کہا کہ مجھے وہ سری ہی دے دو۔ لہٰذا وہ سری لے کر اپنے گھر کی ضرورت پوری کرنے روانہ ہوا۔

حضرت خواجہ حسن بصریؒ اپنے اس سود خوار پڑوسی کے لئے دعائیں مانگتے رہتے تھے۔

"یا اللہ دور و دراز سے تیری مخلوق مجھ سے فیض یاب ہو رہی ہے، میرا پڑوسی محروم ہے۔ یا اللہ! اسے ہدایت فرما۔"

حسب دستور حضرت خواجہ صاحبؒ ایک دن دعا مانگ رہے تھے کہ آپ کے اس پڑوسی حبیب عجمی کے دل میں خیال آیا کہ دور سے لوگ آ کر فیض یاب ہو جائیں اور میں پڑوسی ہو کر محروم رہوں۔

بات مروت سے بعید ہے۔ لہذا اس خیال کے آنے پر وہ حضرت خواجہ صاحبؒ کی زیارت کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں لڑکے کھیل رہے تھے۔ ایک لڑکے نے دوسرے لڑکوں کو کہا۔ کہ دور بھاگو کیونکہ حبیب سود خوار آرہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی شامت ہم پر پڑ جائے۔ اس بات کا آپ پر بڑا اثر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے اسباب مہیا کر دئے۔ الغرض وہ حضرت خواجہ صاحبؒ کی خدمت میں پہنچے اور بیعت سے مشرف ہوئے۔ سود خواری سے توبہ کی۔

حضرت خواجہ صاحبؒ کی صحبت بابرکت آپ پر اثر انداز ہوئی ؎

گر تو سنگ خارا و مرمر بودی
چوں بصاحبدل رسی گوہر شوی

ہلیلہ کو جب شہد میں ڈالتے ہیں تو تھوڑے دنوں کے بعد اس کی کڑواہٹ مٹھاس میں بدل جاتی ہے۔ اسی طرح شیخ متبع شریعت کی صحبت کا اثر مرید پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے رذائل کو اخلاقِ حسنہ سے مزین کر دیتا ہے۔

حضرت حبیبؒ نے حضرت خواجہ صاحبؒ کی صحبت میں رہ کر خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ جب آپ بیعت ہو کر گھر لوٹ رہے تھے تو انہیں لڑکوں سے آپ گزرے، تو اسی لڑکے نے دوسرے لڑکوں کو کہا کہ بھائیو! دور ہٹ جاؤ۔ حبیب تائب ہو کر آرہے ہیں، کہیں ہماری شامت کا پر تو آپ پر نہ پڑ جائے۔

بیعت، توبہ کے بعد آپ نے مقروضوں کو قرضہ معاف کر دیا۔ اور ذکر و فکر میں مصروف ہو گئے ـــــ ایک دن خواجہ حسن بصریؒ جنگل میں تشریف لے گئے۔ وہاں حضرت حبیبؒ کی پوستین پڑی دیکھی، آپ وہیں ٹھہر گئے۔ جب حبیبؒ وہاں تشریف لائے تو آپ نے دریافت کیا کہ پوستین کس کے حوالے کر گئے تھے، آپ نے جواب دیا حضرت اس کے حوالے کر گیا تھا جس نے آپ کو یہاں حفاظت کے لئے بھیج دیا۔ اللہ تعالیٰ پر توکل رکھنا بہت بڑی چیز ہے۔

حضرت حبیبؒ پڑھے لکھے نہ تھے مگر سائل کو مسئلہ صحیح بتا دیتے۔ صحیح اور موضوع حدیث بتا دیتے۔ کسی شخص نے پوچھا کہ آپ پڑھے ہوئے نہیں مگر فقہ کا مسئلہ کیسے بتاتے ہیں۔ اور قرآن شریف اور حدیث شریف عربی میں ہیں، وہ کیسے سمجھ لیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا جب ضرورت ہوتی ہے تو فقہ کا مسئلہ حضرت امام صاحبؒ سے پوچھ لیتا ہوں۔ قرآن شریف جس وقت تلاوت کیا جاتا ہے۔ تو اس وقت نور نکلتا ہے، میں سمجھ لیتا ہوں کہ خدائی نور ہے۔ جب حدیث صحیحہ پڑھی جاتی ہے۔

تو نورِ نبویؐ نکلتا ہے ۔ لہٰذا میں سمجھ لیتا ہوں کہ حدیث صحیح ہے ۔ جب موضوع حدیث پڑھی جاتی ہے تو نور نہیں نکلتا ۔ لہٰذا میں سمجھ لیتا ہوں کہ یہ موضوع ہے ۔

ایک دن امام ابو یوسفؒ اور امام احمد حنبلؒ نے طے کیا کہ حضرت حبیبؒ سے امتحان کے طور پر کوئی مسئلہ دریافت کریں ۔ آپ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص کی نماز قضا ہو گئی ہے مگر اس کو یاد نہیں کہ کون سی نماز قضا ہوئی ہے ۔ اب وہ کیا کرے ۔ ؟ حضرت حبیبؒ نے فرمایا کہ یہ بڑے غافل دل والا ہے ۔ جس کو اتنی غفلت ہو اسے پانچوں نمازیں قضا پڑھنی چاہئیں ۔ حقیقت میں مسئلہ بھی ایسے ہے ۔

فرمایا : لوگو ! باطن کی صفائی بڑی چیز ہے ، کوئی اندھا نہ جانے تو اسکی مرضی ۔ ہماری ضد نہیں ۔

خاک شو در پیشِ شیخ باصفا
تا زِ خاکِ تو بروید کیمیا

تا نیرد دانۂ اندر زمیں　　　تا زیک صد کے شود اندر زمیں

تا نمیری اے سگِ دنیا پرست
رازِ حق را تو چرا آری بدست

فرمایا : ہر علم کے واسطے استاد کی ضرورت ہوتی ہے ۔ علم باطن کے واسطے بھی استاد کی ضرورت ہے ۔ مسلمانو ! نیکیوں میں جلدی کرو ۔ اور ہر بدی سے بچو ۔ دل کا علاج کرو ۔ کوئی بیماری تم کو آتی ہے تو کتنے حکیم تلاش کرتے ہو ۔ اگر ایک حکیم کا علاج فائدہ نہیں دیتا تو دوسرے حکیموں کے پاس جاتے ہو ۔ اگر یونانی حکیموں سے فائدہ نہیں ہوتا تو ڈاکٹروں کے پاس جاتے ہو ۔ غرض جب تک شفا نہیں ہوتی حکیموں اور ڈاکٹروں کا دروازہ نہیں چھوڑتے ہو ۔ ظاہری جسمانی مرض کے لئے تم ساری دنیا کے حکیم نہیں چھوڑتے ۔ مگر تمہارا قلب جو رئیس الاعضاء ہے ، وہ بیمار ہے ، وہ اللہ کے راستے سے اندھا ہو گیا ہے ۔ اس کے علاج سے تم غافل ہو ۔ تم ایک بھی حکیم روحانی متبع شریعت کے پاس نہیں جاتے ۔ یہ کیسا انصاف ہے ۔

فرمایا : لوگ اس خیال کے ہیں کہ جب ایک پیر پکڑا جائے تو دوسرے پاس نہ جانا چاہیئے ۔ ایک آنکھ میں درد ہو تو چوبیس ۲۴ حکیم ڈھونڈتے ہو ۔ ایک سے فائدہ نہ ہو تو دوسرے کے پاس جاتے ہو ۔ جب تیرے قلب کی اصلاح ایک سے نہیں ہوئی تو دوسرے کے پاس کیوں نہیں جاتا ۔

مسلمان بھائیو ! مقصود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے نہ پیر ۔ اگر ایک پیر تم نے پکڑا ، اسکی خدمت میں بہت آتے جاتے رہے ۔ ذکر و فکر میں محنت بھی کرتے رہے ۔ لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا ، تو اس حالت

میں دوسرے پیر کی تلاش کرنی چاہیئے۔ حضرت مولینا جامیؒ فرماتے ہیں ؎

باہر کہ نشستی و نشد جمع دلت
از تو نہ رمید زحمت آب و گلت
از صحبت وے اگر تبرّا نہ کنی ہرگز نہ کند روحِ عزیزاں بحلت

ہر شخص کو اپنی اصلاح کرنی ضروری ہے۔ جس جگہ تمہاری اصلاح ہو جائے وہاں جمے رہو۔ ایسی حالت میں دوسرے کے دروازے کی طرف بھاگنا بالکل ناشکری اور باعثِ محرومی ہے۔

فرمایا: ایک بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کی ہو اور وہ فوت ہو گیا ہو، اور اس کے فیض سے طالب محروم رہا ہو، اور کچھ حاصل نہ کیا ہو تو اس حالت میں دوسرا پیر پکڑنا لازم ہے۔ اس سے پہلی بیعت نہیں ٹوٹتی۔ بلکہ یوں سمجھے کہ پہلے مرشد کی مہربانی ہے، اس سے بداعتقاد نہ ہو، بلکہ یوں سمجھے کہ میرا مقسوم ان کے پاس نہ تھا۔

اللہ کے بندو انصاف کی نظر سے دیکھو۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کے چار پیر تھے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے بھی چار پیر تھے۔ مقصود تو ایک خدا کی ذات ہے۔ خدا کے بندو خدا کے طالب بنو۔

فرمایا: پیر پکڑنے سے مراد یہ ہے کہ اس سے ہدایت حاصل ہو۔ کھیت کی پیداوار میں پیر کا حصہ مقرر کرنا مقصود نہیں۔ چٹی بھرنا مقصود نہیں۔ مسلمانو! افسوس کا مقام ہے کہ رسمی پیر خراب کر رہے ہیں ان کو اپنے در پر نہ آنے دو۔ یہ گمراہ کر رہے ہیں۔ یہ کس کتاب کا مسئلہ ہے کہ اناج میں سے پیر کا حصہ ہے۔ پیر صاحب شریعت پکڑو۔ حقہ اور بھنگ پینے والے بے نماز اور بے دین سے بچو۔ ایسا پیر شیطان ہے۔ خود بھی گمراہ ہے اور تم کو بھی گمراہ کرے گا۔ فرمایا: پیر کی شناخت میں تم کو بتاتا ہوں پیر وہ ہے جو خود بھی شریعت کے اوامر و نواہی پر کاربند ہو اور اپنے مریدوں کو بھی شریعت پر چلائے۔ اس کی صحبت میں بیٹھنے سے دنیا کی محبت سرد پڑ جائے۔ اسے دیکھنے سے اللہ تعالیٰ یاد آئے، وہ پرہیزگار اور متقی ہو۔ شبہ کی چیز نہ کھاتا ہو۔ کسی بزرگ کا صحبت یافتہ ہو۔ کسی بزرگ نے اسے اجازت دی ہو۔ بقدر ضرورت علمِ شریعت جانتا ہو۔ علم سلوک سے بھی واقف ہو۔ ایسی صفات والا پیر پکڑو، بے دین کو چھوڑ دو۔ ع

او خود گم است کرا رہبری کند

---★---

ایڈیٹر کے قلم سے

تعارفِ کتب

کتابوں کا کافی ذخیرہ جمع ہو جانے کی وجہ سے کسی کتاب پر مفصل تنقید یا تبصرہ ممکن نہیں۔ اس لئے محض اجمالی تعارف پر اکتفار کیا جاتا ہے۔ کسی کتاب کے وہ حصے جو سرسری مطالعہ کی وجہ سے تبصرہ نگار کی نظر سے نہ گذر سکے ہوں اس کے مندرجات کے بارہ میں ایڈیٹر کی رائے محفوظ رہے گی۔۔۔۔

"ادارہ"

اسلام اور سود از ڈاکٹر انور اقبال قریشی ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ صفحات ۳۱۶ قیمت مجلد دس روپے
ناشر: حانیہ پبلشنگ ہاؤس ۲/۲۹۵ سرور روڈ۔ لاہور چھاؤنی۔

اسلام اور سود ہمارے ملک کے مشہور ماہر معاشیات قریشی صاحب کی شہرۂ آفاق کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے جو ترمیم اور ایک طویل باب کے اضافے کیساتھ شائع ہوئی ہے، نئے باب میں بلا سود بنکاری کے امکانی صورتوں کے علاوہ یہ بھی ثابت کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ بنکوں اور بیمہ کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لینا اسلامی اور معاشی دونوں لحاظ سے ضروری ہے، فاضل مصنف نہ صرف برصغیر بلکہ بیرون ممالک میں بھی اپنے موضوع میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔۔۔ یہ کتاب ان کے ۲۵ سالہ گہرے مطالعہ اور طویل غور و فکر کا حاصل ہے۔ افلاطون کے عہد سے لیکر کینس تک سود سے متعلق مشہور نظریات پھر اسلام کے نظریۂ حرمتِ سود کی محققانہ تشریح اور ہر پہلو پر سیر حاصل فنّی بحث اور منطقی طرزِ استدلال کتاب کی خصوصیت ہے کتاب فنِ معاش کے لحاظ سے بھی معاشیات میں ایک مفید اضافہ ہے اور زیادہ محظوظ بھی اہل فن ہی ہو سکتے ہیں۔ اسلام نے سود کی ہلاکت آفرینیوں کا جو اعلان آج سے چودہ سو سال قبل کیا تھا۔ ایک ماہر فن کی لکھی ہوئی اس کتاب نے مسئلہ کے ہر پہلو پر دلائل سے گفتگو کر کے سودی نظام کی تباہ کاریوں پر مہر لگا دی ہے، اور اس طرح عقلی فنی اور علمی لحاظ سے بھی سود خواروں پر اتمام حجت ہو گئی۔ کتابت میں جگہ جگہ اغلاط ہیں، عربی عبارات پر خاص توجہ کی ضرورت تھی۔ حق تعالیٰ مؤلف کی اس کاوش کو مسلمانوں کے حق میں بار آور بنا دے۔ کتاب میں پروفیسر گیانی چند (پٹنہ یونیورسٹی) کا پیش لفظ علامہ سلیمان ندوی کا دیباچہ اور علامہ مناظر احسن گیلانی کا عالمانہ مقدمہ بھی شامل ہے۔۔۔۔

الفہرست اردو ترجمہ | تالیف محمد بن اسحاق بن ندیم الورّاق۔ اردو ترجمہ از مولانا محمد اسحاق بھٹی صفحات ۸۴۲ ۔ قیمت مجلد بیس روپے۔ ناشر: ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ۔ لاہور۔

علوم و فنون اور کتب و مصنفین کی فہرست ایک مستقل علم کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ ابن ندیم کی کتاب الفہرست کو بھی اس موضوع میں وقیع اور امتیازی مقام حاصل ہے۔ ورّاق کی یہ کتاب چوتھی صدی ہجری تک کے علوم و فنون۔ سیر و رجال اور کتب و مصنفین کی مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے۔ اس میں آسمانی صحائف، دنیا بھر کی مروجہ مذاہب، زبانیں اور ان کا اسلوب کتابت اور ارتقاء کے مراحل کے علاوہ مروجہ علوم آلیہ از قبیل لسانیات، عقلیات، نیز نجات اور پھر ان علوم کے مختلف مکاتب فکر کے بارہ میں اہم تفصیلات جمع کی گئی ہیں، ادارہ ثقافت اسلامیہ نے اس عربی کتاب کا اردو ترجمہ موجودہ شکل میں شائع کر کے اردو زبان میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ فاضل مترجم ہمارے مکرم و محترم دوست مولانا محمد اسحاق بھٹی ہیں جنہوں نے اصل کتاب کے کئی مطبوعہ نسخے سامنے رکھ کر نہایت اہتمام سے اس کا ترجمہ کیا اور پھر ضروری اور مفید حواشی دے کر کتاب کی افادیت اور بڑھا دی۔ اگر ہر صفحہ کے حواشی اسی صفحہ کے نچلے حصہ میں دیدئے جاتے تو ان حواشی سے قاری زیادہ آسانی سے فائدہ اٹھا سکتا، عام تجربہ یہ ہے کہ سارے مقالہ کے اختتام میں حواشی یکجا طور پر دے دینا اس کی افادیت ختم کر دیتا ہے۔ سہل پسندی اور رواروی کے اس دور میں کسی حاشیہ کیلئے مضمون کا تسلسل توڑ کر اوراق گردانی کرنا کٹھن کام ہونے کے علاوہ ذوق مطالعہ کیلئے بھی گراں سی بات ہے۔ ذاتی ذوق تو یہی ہے کہ کسی متن سے متعلق کوئی حاشیہ اسی صفحہ کے ذیل میں دینا چاہئے۔ اس کے علاوہ کتاب میں دنیا کی مختلف زبانوں اور تحریر و کتابت کے جو نمونے دئے گئے ہیں ان کی طباعت اور عکاسی کا بھی زیادہ اہتمام ہونا چاہئے تھا تاکہ کسی خط کی اصل تصویر سامنے آسکتی۔ بہرحال ان دو ایک کتابی اور طباعتی باتوں کو چھوڑ کر ایک نہایت وقیع اور اہم خدمت، کی توفیق فاضل مترجم اور ناشر کو نصیب ہوئی ہے۔ ابن ندیم کے اس علمی شاہکار سے اب اردو دان طبقہ بھی مستفیض ہو سکے گا۔

ہدایۃ الحیران | مؤلفہ مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی فاضل دیوبند۔ صفحات ۱۲۷، کتابت و طباعت متوسط، قیمت ۶/- روپے۔ ناشر حسینیہ حنفیہ سلانوالی۔ سرگودھا۔

یہ کتاب مولانا حسین علی صاحب مرحوم کے افادات تفسیر جواہر القرآن مرتبہ مولانا غلام اللہ خان صاحب راولپنڈی کے ان مقامات پر عالمانہ اور سنجیدہ تنقید ہے جو مسلک جمہور اہل سنت کے خلاف ہیں رد بدعات کے لئے کتاب کی افادیت مسلّم ہونے کے باوجود ایسے مقامات کی نشاندہی ایک

علمی و دینی خدمت ہے۔ جو افراط و تفریط کا شکار یا جادۂ اعتدال سے ہٹے ہوئے ہیں۔ فاضل مؤلف مولانا ترمذی نے سنجیدگی اور متانت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بڑی محنت سے کتاب کو مرتب فرمایا ہے۔ ایسی چیزیں علمی اور دینی خدمات کے ضمن میں آتی ہیں، بشرطیکہ بحث و نزاع اور جدل و جدال یا تعصب اور تحزب کا ذریعہ نہ بنائی جائیں۔ اہل حق کا سینہ ہمیشہ سنجیدہ علمی تنقید کیلئے کھلا رہتا ہے۔ اور وہ کسی غلطی پر تنبیہ کی صورت میں رجوع الی الحق کی طرف مستعد ہوتے ہیں۔ توقع ہے کہ فروعی عقائد یا فروعی فقہی مسائل کی تحقیق کے سلسلہ میں یہ کتاب اہل علم کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔

خلافت و ملوکیت تاریخی و شرعی حیثیت	مؤلفہ مولانا صلاح الدین یوسف صاحب، صفحات ۵۸۴ - قیمت مجلد قسم اول ۱۲/۷۵ روپے، قسم دوم ۱۰/۵۰ روپے۔

پتہ: جامع مسجد اہل حدیث مصطفیٰ آباد (دھرم پورہ) لاہور۔ ——— مودودی صاحب کی کتاب خلافت و ملوکیت پر علمی اور دینی حلقوں میں بجا طور پر ایک طوفان اٹھا، کیونکہ یہ کتاب تاریخ اسلام کے ایک ایسے نازک دور اور مقدس طبقہ سے ایک ظالمانہ مذاق تھا جس سے مسلمانوں کو بڑا جذباتی مگر علمی دینی اور روحانی لگاؤ تھا۔ یہ مذاق جو بقول مولانا صلاح الدین یوسف علمی و دینی مقاصد کا نہیں بلکہ مخصوص آمرانہ ذہن اور سیاسی زاویۂ فکر کی پیداوار تھی۔ ایک ایسے دور میں کیا گیا کہ وقت کے سیاسی حالات اور تقاضے ہرگز ہرگز اسلامی حلقوں میں افتراق و انتشار کی اس کوشش کے روادار نہ تھے۔ نتیجۃً کتاب پر اہل علم اور اہل حق کی طرف سے بڑی لے دے ہوئی اور جید علماء اور اصحاب قلم نے اسے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ پیش نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم اور مفید کڑی ہے اور مصنف کے خیال میں کتاب پر تنقید کے سلسلہ میں جو پہلو اب تک تشنہ رہ گئے تھے۔ ان پر تفصیلی مگر تحقیقی بحث کی گئی ہے۔ کتاب پانچ ابواب اور بیسیوں مباحث پر مشتمل ہے اور ان تمام الزامات اور دسیسہ کاریوں کی قلعی کھول دی گئی ہے۔ جس نے صحابہ کرام کی شان بالخصوص سیدنا عثمانؓ و سیدنا معاویہؓ کی بلند و بالا قدر و منزلت مجروح ہو سکتی تھی۔ اگر نازک سے نازک تر حالات میں بھی جماعت اسلامی اپنے رہنما کی دفاع اور وکالت ایک فریضہ سمجھ کر پوری قوت و صلاحیت اس پر لگا سکتی ہے تو صحابہ کرام کی مدافعت اور ان کے مقام و منزلت کا تحفظ تو بہر حال اہم فرائض اور ہر مسلمان کی دینی حمیت کا لازمی تقاضا ہونا چاہیے۔ پھر معلوم نہیں جماعت کے ارباب فکر ورائے اہل حق کے ایسے اہم ترین فرائض دینی پر چیں بجبیں کیوں ہونے لگتے ہیں۔؟ فاضل مصنف نے اتنے طویل مباحث میں بھی سنجیدگی اور متانت کا دامن نہیں چھوڑا قارئین کو بعض جگہ طوالت محسوس ہوگی جو ایک حد تک ناگزیر

تھی۔ کتاب کا بنیادی مسئلہ گویا یہ ہے کہ صحابہ کرام کی بعض حکومتوں میں مبیّنہ تبدیلیوں کا سبب صرف ملوکیت نہیں تھی اور نہ ملوکیت مطلقاً گردن زدنی چیز ہے۔ یہ مسئلہ اہل علم کے مزید غور و فکر کا مستحق ہے۔ کاش! پورے اسلام کو جمہوریت کے دائرہ میں محصور کرنے والے حضرات اپنے ملک میں جمہوریت ہی کے پیدا کردہ حالیہ ثمرات اور نتائج کو دیکھ کر اپنے موقف پر کچھ نظر ثانی کر سکیں، کہ یہ سب کچھ تو جمہوریت کی کرم فرمائی ہے ___ ع باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست ___ کتاب کے آغاز میں تعدیل صحابہ پر مولانا محمد یوسف بنوری مدظلہٗ کا مقالہ بھی شامل ہے، امید ہے کہ فاضل مؤلف کی محنت اور اس دینی و علمی کدوکاوش کا علمی حلقوں میں گرمجوشی سے خیر مقدم کیا جائے گا۔

AFRICA THE MUSLIM CONTINENT | از جناب انعام اللہ خاں صاحب جنرل سیکرٹری مؤتمر عالم اسلامی پوسٹ بکس ۵۰۳۰ کراچی نمبر ۲۔ انگریزی زبان کے اس مختصر کتابچہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ افریقہ صرف مسلمانوں کا برّاعظم ہے اور وہاں عیسائیت کا اکثریت میں ہونا عیسائیوں کا پروپیگنڈہ ہے اور آبادی وغیرہ کے لحاظ سے افریقہ عیسائیوں کا نہیں، مسلمانوں کا برّاعظم کہلا سکتا ہے۔ اس کتابچہ سے مسلمانوں کو افریقہ کے بارے میں صحیح علم حاصل ہوگا ___ کیا اچھا ہوتا اگر مؤتمر عالم اسلامی یا اس طرح کوئی دوسرا اہم ادارہ اسلامی ممالک کے تعاون سے پوری دنیا کی مسلم آبادی کے بارے میں آزادانہ تحقیق کر کے مسلمانوں کے صحیح اعداد و شمار مہیّا کر سکتا۔ اس طرح یورپ کے مہیا کردہ اعداد و شمار کا وہ تاثر ختم ہو جاتا کہ آبادی کے لحاظ سے مسلمان دنیا کی دوسری قوم ہے۔ مدت ہوئی ایک مسلمان رہنما امیر شکیب ارسلان نے اپنے طور پر کسی حد تک یہ کام کیا، مگر اب تو وسائل، ذرائع، اسلامی ممالک کی آزادی ___ اور آبادی میں اضافہ کے لحاظ سے یہ کام بہت ضروری ہو گیا ہے۔

تبلیغی رسائل۔ بیت التوحید | (۱) مسخروں کی محفل یا قادیانی انبیاء، صفحات ۳۷، قیمت ۶۰ پیسے۔ (۲) حکومت مغربی پاکستان کے پانچ سوال اور ان کا جواب صفحات ۴۲، قیمت ۶۰ پیسے۔ (۳) عبرتناک موت، صفحات ۱۶۔ (۴) مرزائی دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ از جناب محمد اکبر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج راولپنڈی صفحات ۳۹، قیمت ۶۰ پیسے۔ (۵) تفہیم النبوۃ از جناب ابوالخیر اسدی، صفحات ۴۸، قیمت ۷۵ پیسے۔ پانچوں رسائل قادیانیت کی تردید اور مسئلہ ختم نبوت کی تحقیق کے سلسلہ میں ہیں۔ ناشر کتب فرزند توحید صاحب ایسے عام فہم تبلیغی لٹریچر پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ یہ تمام رسائل بیت التوحید ۱۳/۷ اے آصف کالونی کراچی ۱۹ سے طلب کی جا سکتی ہیں۔

■■

٭ بڑے مسلمان کے پہلے ایڈیشن پر تبصرہ پچھلے ماہ آچکا ہے۔ اب دوسرا ایڈیشن اضافوں کے ساتھ آچکا ہے۔ جس کی قیمت -/۳۰ روپے ہے۔

تهنئة الانتخاب

شرارة القلب وتهنئة الانتخاب يقدمها الى السيد الاستاذ الشيخ الكبير مولانا عبد الحق حقانی مدظلہ شیخ الحدیث ومدیر دار العلوم الحقانیہ اکوڑہ خٹک محمد صدیق ابن مولوی محمد شریف تلمیذہ الوفی فاضل دار العلوم الحقانیہ وجامعۃ الازہر قاہرہ --- (مد)

---★---

هذه القصيدة تمثل لوناً جديداً من الادب العربي الحديث فهي ليست من بحر واحد وعلى وزن مخصوص وانما هي من بحور مختلفة واوزان عديدة ومن هنا تسمى مثل هذه القصائد (مجمع البحور) وقد جاء بهذا اللون بعض ادباء العرب المحدثين من بلدان عديدة متطورين بذالك الادب العربي نحو الجدة والمرونة والسهولة

وقد سرنا على خطاهم لا المقلدين لهم بل لنجلو الابناء المدارس العربية الباكستانية هذا اللون الجديد فانهم مارسوا الادب القديم فحسب وهو ولي التوفيق --- (محمد صديق)

---★---

دعني لقيثاري اغرّد منشدا — شعري الطروب سبونة وغناء

فاليك يا سيدي تحية مباركة — موصولة بمودة وهناء

تحية من تلميذكم وتهنئة — جاءت من غير مشقة وعناء

فاهنأ بما حققت يمينالك — فيه الحياة للشعوب والابناء

ماكان هذا سوى طهر قد انعكست — منه الاشعة في القرى والانحاء

فلاح نجمك الزاهي لذي نظر — فاعطاك صوتهٔ في ضوضاء

فاهناً هناً یا ملک الغرّاء　　عزتها تضئ لیلة الظلماء
قد کنت غلّابا و فی کل جولة　　لک النصر محققو دا للـواء
حلیفک النصر فی کل امر　　من جلی او کان فی خفاء
ما اسعد النسان ثبتت امنیة　　وحباه الدهر بالتأیید والنماء
قد کان هذا العمری منتهی املی　　ان یکون سیدی محرز الکل سناء
سل الاعادی لکم کیف ذهبوا　　یوم الانتخاب فی الهباء
الخزی لاحقتهم حتی　　تسللوا تحت الـر داء
راموا التعالی برغم العی　　علی ذوی العزّ و الآلاء
هیهات لن یبلغوا مآربهم　　وان صعدوا فی اسباب السماء
رد اللّٰه کیدهم فی نحورهم　　حتی رقّ لهم قلبی للعزاء
منیة الدرع لم تبرح صلابتها　　متار الخون لذی البطش والعداء
تحدیت جیوش الظلم زاحفة　　حتی اصبح الحق فی العلاء
لقد کنت عبد الحق تمثله حقا　　قولا و عملا لبسنة خیر الانبیاء
قد سدت علی الجبل بالخلق　　والصدق والاخلاص والاباء
لاغروانت اهل لذلک　　بل فوقه من اعلی العلیاء
بنیت المعالی اخاما تسّتها　　تغذی دار العلوم من اصدق الابناء
فای صنیع قد کان من صنا نعهم　　مثل ما اتیت به من صنائع النبلاء
لقد وهبت لنفسک حقا　　لخدمة الناس بالعلم والعلماء
فالعلم ینشی اقواما ویدفعهم　　الی الوجود بتعزیز واجلاء
امّا الجهالة یا و یحی لکم جلبت　　علی ذویها من الذل والشقاء
علی القناعة رضیت نفسک　　فآمنتها من الدهر والویلاء
ما المال فی نظرک عارضة　　ولا المناصب ما کانت بالاغراء
روح الاسلام کانت تحفزک　　لتمثلها فی البرلمان والاعضاء
انت الأمین علی الشریعة اتصنها　　من شر الزوال وسفه السفهاء
لتسیر علی سنن الاسلاف وتکمل　　بک الرعایة من الرجال والنساء

تحب عفو العاثرین تکرما — وتعطف علی الایتام والفقراء
لتستمسك بالحق غیر مفرط — وان لاقیت فیه عسف الجهلاء
لاغرو ان املك الاقوام فی شخف — شتی المکارم تحیط بك بلا استثناء
قد جئت من الود نادراست — وجئت فی الخلق ماینذر فی العظماء
اذ جمع الیوم اهل الود فاجتمعت — منا القلوب بدار العلوم والاهناء
فشکرالك ما اهداك من کلم — اشهی الی النفس من اطیب النعماء
لازال ذکرك فی الوری یردده — بنو المواطن من ذوی الحقد والولاء
هذی شرارة قلبی تمثل عاطفة — نبعت عن الانفعال وسدائ